معاصر اردو افسانے کے فکری رجحانات کا تجزیاتی مطالعہ

(سہ ماہی "ادبیات" اسلام آباد (۲۰۱۱ء تا حال) میں شائع شدہ افسانوں کے حوالے سے)

مقالہ برائے ایم۔فل (اردو)

مقالہ نگار:

سید فاضل حسین

فیکلٹی آف لینگوئجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

مئی، ۲۰۱۹ء

معاصر اردو افسانے کے فکری رجحانات کا تجزیاتی مطالعہ

(سہ ماہی "ادبیات" اسلام آباد (۲۰۱۱ء تا حال) میں شائع شدہ افسانوں کے حوالے سے)

مقالہ نگار:

سید فاضل حسین

یہ مقالہ

ایم۔فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگوئجز

(اردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

مئی ۲۰۱۹ء

مقالے کا دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا او مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگوئجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: معاصر اردو افسانے کے فکری رجحانات کا تجزیاتی مطالعہ

(سہ ماہی "ادبیات" اسلام آباد (۲۰۱۱ء تا حال) میں شائع شدہ افسانوں کے حوالے سے)

پیش کار: سید فاضل حسین رجسٹریشن نمبر: 1375/M/U/F17

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: اردو زبان و ادب

ڈاکٹر عابد حسین سیال _____

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر محمد سفیر اعوان _____

ڈین فیکلٹی آف لینگوئجز

بریگیڈیئر محمد ابراہیم _____

ڈائریکٹر جنرل

تاریخ _____

اقرار نامہ

میں، سید فاضل حسین حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز اسلام آباد کے ایم فل سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر عابد حسین سیال کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گا۔

سید فاضل حسین

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

فہرست ابواب

عنوان	صفحہ نمبر
مقالہ کا دفاع کی منظوری کا فارم	ii
اقرار نامہ	iii
فہرست ابواب	iv
Abstract	vii
اظہار تشکر	viii
باب اول: موضوع تحقیق کا تعارف اور بنیادی مباحث	صفحہ ا تا ۳۰
الف۔ تمہید	۱
i۔ موضوع کا تعارف	۱
ii۔ بیان مسئلہ	۱
ii i۔ مقاصد تحقیق	۲
Iv۔ تحقیقی سوالات	۲
v۔ نظری دائرہ کار	۲
vi۔ تحقیقی طریقہ کار	۲
vii۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق	۳
viii۔ تحدید	۳
ix۔ پس منظری مطالعہ	۴
x- تحقیق کی اہمیت	۴
ب: اردو افسانہ	۴
i۔ اردو افسانے کا مختصر پس منظر	۵
ii۔ اردو افسانہ اکیسویں صدی میں	۱۰

ج۔ سہ ماہی 'ادبیات' اسلام آباد ۱۶
i۔ اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد: مختصر تعارف ۱۶
ii۔ سہ ماہی 'ادبیات' تعارف ۱۹
iii۔ سہ ماہی 'ادبیات' ادبی خدمات ۲۰
iv۔ اردو افسانے کے حوالے سے 'ادبیات' کی خدمات ۲۳
د۔ معاصر اردو افسانے کے فکری رجحانات: اجمالی جائزہ ۲۴
حوالہ جات ۲۸

باب دوم: معاصر اردو افسانہ اور نائن الیون صفحہ ۳۱تا۷۲

الف۔ نائن الیون: پس منظر، تعارف اور ادب پر اثرات ۳۱
I۔ پس منظر ۳۱
ii۔ تعارف ۳۲
iii۔ نائن الیون کے اثرات ۳۳
iv۔ نائن الیون انگریزی ادب پر اثرات: مختصر جائزہ ۳۴
v۔ اکیسویں صدی کی پہلی دہائی کا اردو افسانہ اور نائن الیون ۳۵
ب۔ معاصر اردو افسانہ اور نائن الیون ۴۴
i۔ امن وامان کی خراب صورت حال ۴۴
ii۔ خوف اور بے چینی کی عکاسی ۵۴
iii۔ مغربی ممالک کے عزائم کے اشارات ۵۹
iv۔ معمولات زندگی میں تبدیلی کی عکاسی ۶۴
حوالہ جات ۶۹

باب سوم: معاصر اردو افسانہ اور عالمگیریت صفحہ ۷۳تا۱۱۳

الف۔ عالمگیریت: تعارف اور پس منظر ۷۳

ب۔ معاصر اردو افسانے پر عالمگیریت کی اثرات ۸۱

i۔ پرانی تہذیب کا نوحہ ۸۱

ii۔ دیہی معاشرت پر جدید تہذیب کے نشانات ۸۸

iii۔ مغربی کلچر کا فروغ ۹۳

iv۔ اقدار کا زوال ۹۷

v۔ جدید تہذیب کے پیدا کردہ جنسی و نفسیاتی مسائل ۱۰۳

حوالہ جات ۱۱۰

باب چہارم: معاصر اردو افسانہ اور تانیثیت صفحہ ۱۱۶ تا ۱۴۳

الف۔ تانیثیت: تعارف اور پس منظر ۱۱۶

ب۔ معاصر اردو افسانے پر تانیثیت کے اثرات کا تجزیاتی مطالعہ ۱۲۲

i۔ صنفی امتیاز کی صورتوں کی عکاسی ۱۲۳

ii۔ صنفی استحصال کی عکاسی ۱۳۱

حوالہ جات ۱۴۰

باب پنجم: مجموعی جائزہ، نتائج اور سفارشات صفحہ ۱۴۴ تا ۱۵۲

الف۔ مجموعی جائزہ ۱۴۴

ب۔ نتائج ۱۵۰

ج۔ سفارشات ۱۵۲

کتابیات ۱۵۴

Abstract

Title: Analysis of Thematic Trends of Contemporary Urdu Short Story

Abstract:

With the start of 21st century, significant political and social changes appeared around the globe. Pakistani society was also influenced by these changes resulting new thematic trends in literature. Urdu short story written in Pakistan reflects 9/11 issue, globalization and feminism as major themes in recent era. This research focuses on analysis of Urdu short stories in the above context selecting a sample of short stories published in Quarterly "Adabiat" Islamabad from 2011 to 2018 period.

Thesis comprises of five chapters: In the first chapter explanation of key terms, research methodology and introductory information is given about the topic. Second chapter titled "Contemporary Urdu Short Story and 9/11" discusses short stories in the backdrop of 9/11 issue. How 9/11 hit common man's psyche and what was its traumatic effect on the people of this region, how war on terror effected daily life of the people and created an atmosphere of fear, how Urdu short story reflected the situation through its theme and characters, all this is analyzed in this chapter. Third chapter titled "Contemporary Urdu Short Story and Globalization" presents analysis of short stories in the context of changing situation of society due to global cultural pressures. Fourth chapter titled "Contemporary Urdu Short Story and Feminism" discusses themes related to feminist approach in Urdu short stories of selected period. In the recent years feminism emerged as one of the popular themes in literature and much have been written for and against it. This chapter discusses how different aspects of feminism have been reflected in contemporary Urdu short story. Fifth chapter consists of findings and recommendations.

اظہارِ تشکر

میں مقالے کی تکمیل کے لیے سب سے پہلے اللہ تعالی کا شکر گزار ہوں جس نے ہر طرح کی نعمت بخشی اور اللہ تعالی نے خاص کرم کیا اور مجھے اپنے کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی ہمت دی۔ میں شکر گزار ہوں صدر شعبہ اردو، ڈاکٹر روبینہ شہناز، کوارڈینٹر فوزیہ اسلم اور انتہائی واجب الاحترام اساتذہ کا، جن کا دست شفقت ہر لمحہ اور ہر پل میرے سر پر رہا۔ میں بالخصوص اپنے نگران اور محسن ڈاکٹر عابد حسین سیال کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے مجھے انگلی پکڑ کر اس راہ میں منزل تک پہنچایا۔ دراصل ان کی حوصلہ افزائی اور ہمت افزائی نے ہی میرے اردوں کو پسپا نہیں ہونے دیا۔ دوسری طرف انہوں نے اپنی ذاتی لائبریری سے استفادے کا موقع دیا اور مجھے کتب بھی عطا کیں۔ میں استاد محترم ڈاکٹر عبد الکریم، ڈاکٹر قاسم بن حسن اور راجا رحمت علی خان صاحب کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے مجھے ادب پڑھنے کی راہ پر ڈالا۔

اپنے والد صاحب کا بے حد ممنون ہوں انہوں نے خود مشقت اٹھائی اور مجھے یہاں تک پہنچایا۔ پھر میں اگر اپنے دوستوں کے احسانات کو بھی اس لمحے نہیں بھول سکتا بالخصوص سلیم اعوان، زاہد اعوان اور روہیل اعوان نے مجھے بھائیوں کی طرح حوصلہ دیا۔ ان کا بھی شکر گزار ہوں۔ اپنے بھائی ساغر نقوی جنہوں نے کراچی سے میرے لیے کتب بھیجی ان کا بھی ممنون ہوں۔ پھر علی ٹرسٹ کالج کا شکریہ ادا نہ کرنا کم ظرفی ہو گی کہ یہاں مجھے ایسا ماحول ملا جس میں کام کرنا بہت آسان لگا۔ اس پر سکون ماحول کی فراہمی کے لیے کالج کی تمام انتظامیہ کا شکر گزار ہوں اور ان کی علم دوستی کو سراہتا ہوں۔ اللہ سب کا حامی و ناصر ہو۔ آمین

سید فاضل حسین
سکالر ایم فل اردو

باب اول:

موضوع تحقیق کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف۔: تمہید

i۔ موضوع کا تعارف:

زیر نظر تحقیق کا موضوع "معاصر اردو افسانے کے فکری رجحانات کا تجزیاتی مطالعہ" ہے جس میں سہ ماہی "ادبیات" اسلام آباد میں ۲۰۱۱ء سے اب تک چھپنے والے افسانوں کو تحقیق کا موضوع بنایا گیا ہے۔ "ادبیات" اردو ادب کے مرکزی دھارے کے جرائد میں شامل ہے جو ۱۹۸۷ء سے مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ یہ ایک سرکاری ادبی پرچہ ہے، اس میں افسانوں کے حوالے سے ایک الگ جگہ مختص ہے جس میں دور حاضر کے لکھنے والے افسانہ نگاروں کو جگہ دی جاتی ہے۔ اس میں چھپنے والے افسانے معاصر عہد کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں۔ اس وقت اردو ادب میں افسانے کے حوالے سے جو نمایاں نام ہیں ان کے افسانے اس پرچے کی زینت بنتے ہیں۔ دور حاضر کا ادیب زندگی کے بہت قریب نظر آتا ہے اس عہد کے تمام عناصر ان کی تحریروں میں نظر آتے ہیں۔ افسانے کا جو سفر پریم چند سے شروع ہو کر آج کے ادیبوں تک پہنچا ہے، اس دوران اس نے کئی ادوار اور تحریکوں کو اپنے اندر سمیٹا۔ یہ ترقی پسندی سے لے کر علامت نگاری سے ہوتا ہوا جدیدیت تک پہنچا ہے۔ اس لیے اس مقالے میں "ادبیات" کے توسط سے معاصر افسانہ نگاروں کے ہاں پائے جانے والے فکری رجحانات کو دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ii۔ بیان مسئلہ:

اس عہد میں لکھنے والوں کی ایک کہکشاں ہمیں نظر آتی ہے ساتھ ادبی پرچوں کی بھی کثرت ہے لیکن ادبیات میں اعلیٰ پائے کا ادب چھپتا ہے۔ اس میں اردو ادب کے نمایاں افسانہ نگاروں کے افسانے شائع ہوتے ہیں۔ آج کے ادیبوں کے ہاں اس بدلتی ہوئی دنیا کا شعور کس قدر ہے، اس کی وجوہات کیا ہو سکتی ہیں کہ آج کا ادیب زندگی کے ساتھ گہرا تعلق بنائے ہوئے ہے اور اعلیٰ پائے کا ادب تخلیق ہو رہا ہے۔ نئے موضوعات نے

کس طرح اردو افسانے میں تبدیلیاں لائی ہیں۔ ان عناصر کو بھی مذکورہ تحقیق میں دیکھا گیا ہے۔

iii۔ مقاصد تحقیق:

زیر نظر تحقیق میں درج ذیل مقاصد پیش نظر رہے:

۱۔ افسانے کے حوالے سے سہ ماہی "ادبیات" خدمات کا جائزہ لینا۔

۲۔ اکیسویں صدی کے اردو افسانے پر بدلتی دنیا کے جو فکری اثرات مرتب ہوئے ہیں ان کا جائزہ لینا۔

iv۔ تحقیقی سوالات:

۱۔ اکیسویں صدی میں اردو ادب میں نمایاں اور امتیازی فکری رجحانات کیا ہیں؟

۲۔ معاصر افسانے کو جدید معاشرت اور تہذیب نے کس طرح متاثر کیا ہے اور جدید افسانے میں جدید تہذیب کی کونسی سی علامات نظر آتی ہیں؟

۳۔ نائن الیون، گلوبلائزیشن، اور تانیثیت کے خصوصی حوالے سے اردو افسانے میں اظہاریے کیا رہے ہیں؟

v۔ نظری دائرہ کار:

افسانہ ایک مختصر کہانی ہے۔ اس کا اپنے عہد کی معاشرت سے گہرا ربط ہوتا ہے کیونکہ ادیب بھی کسی معاشرے کا فرد ہوتا ہے۔ اس پر بہت سی چیزیں اور متنوع حالات اثر ڈالتے ہیں۔ وہ ان تمام چیزوں کے اثرات لیتا ہے اور ان کو اپنی تخلیقات میں سموتا ہے۔ اکیسویں صدی کے اردو ادب میں امتیازی فکری افکار میں نائن الیون کے اثرات، عالمگیریت کے اثرات اور تانیثی فکر کی کارفرمائی نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ انھی تینوں خصوصی حوالوں سے زیر مطالعہ افسانوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

vi۔ تحقیقی طریقہ کار:

ہماری تحقیق کا موضوع چونکہ کے معاصر اردو افسانہ ہے لہذا موضوع سے متعلقہ مطبوعات کی جمع آواری، ترتیب، مطالعہ اور تجزیہ کیا گیا ہے۔ آن لائن مواد سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ "ادبیات" میں جو افسانے ۲۰۱۰ء سے لے کر تا حال جو چھپے ہیں وہ مجوزہ تحقیق میں بنیادی ماخذات تھے۔ ثانوی ماخذات میں اکیسوی صدی میں افسانے پر چھپنی والی تحقیقی اور تنقیدی کتب کے علاوہ مختلف رسائل اور جرائد میں چھپنے

والے مضامین بھی شامل ہوں گے۔ جن تک رسائی کے لیے لائبریریوں سے رجوع کرنے کے علاوہ تحقیق کے جدید ذرائع انٹرنیٹ اور دیگر ماخذات سے بھی حسب ضرورت استفادہ کیا گیا ہے۔

vii۔ مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق:

اردو میں افسانہ نگاری کی کئی جہات پر مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ بہت سے ناقدین اور محققین نے اس میدان میں طبع آزمائی کی ہے۔ جامعاتی سطح پر بھی اس موضوع سے متعلقہ کام ہوا ضرور ہے لیکن یہ کام اپنے آپ میں انفرادی حیثیت کا حامل ہے چونکہ اس سے قبل زیادہ تر کام بیسویں صدی کے افسانہ نگاری کے رجحانات سے بحث کرتا ہے، اس تحقیق میں اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں اہم افسانوں نگاروں کے ہاں پائے جانے والے رجحانات کو دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ "ادبیات" اسلام آباد کی ادبی خدمات کے حوالے سے بھی کام ہوا ہے ان میں ایک مقالہ تعارفی نوعیت کا جب کہ دوسرا ادبیات کے شخصیات نمبرز کے تجسزیاتی مطالعے پر مشتمل ہے۔ ان مقالہ جات کی تفصیل کچھ یوں ہے:

۱۔ سعدیہ افتخار، اکادمی ادبیات پاکستان کی خدمات : تحقیقی اور تنقید جائزہ (اردو زبان کے حوالے سے)، مقالہ برائے ایم۔فل اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء (غیر مطبوعہ)

۲۔ تیمور اختر، ادبیات کے شخصیات نمبرز کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، مقالہ برائے ایم۔فل اردو، وفاقی اردو یونیورسٹی برائے فنون، سائنس و ٹیکنالوجی، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء (غیر مطبوعہ)

viii۔ تحدید:

زیر نظر مقالے میں ۲۰۱۱ء تا حال سہ ماہی "ادبیات" میں چھپنے والے افسانوں کو ہی دیکھا گیا ہے۔ اس میں مجموعی طور پر ۱۳۸ افسانے شامل ہیں ان افسانوں میں تین عناصر کے حوالے سے دیکھا گیا ہے۔ معاصر افسانے پر نائن الیون کے اثرات، تانیثیت کے اثرت اور گلوبلائزیشن کے کے اثرات کے حوالے سے تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔ ادبیات میں چونکہ دوسری زبانوں کا ادب بھی چھپتا رہا ہے۔ جس میں مقامی اور بین الاقوامی ادب کے افسانوں کے تراجم بھی شائع ہوتے رہے ہیں زیر نظر مقالے میں صرف اردو ادب کے تخلیقی افسانوں کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا گیا ہے۔ مندرجہ بالا تین موضوعات کے علاوہ دیگر جہات

ہمارے موضوع کا حصہ نہیں ہوں گی۔

ix۔ پس منظری مطالعہ:

اردو افسانے میں اس سے پہلے بہت سا تنقیدی کام ہوا ہے۔ افسانہ کو مختلف تنقیدی جہتوں کے تحت پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اردو افسانے کو تحریکوں کے حوالے سے بھی دیکھا گیا۔ محققین نے اعلیٰ پائے کا کام کیا ہے لیکن اس سے قبل مذکور ہوا کہ یہ کام زیادہ تر بیسویں صدی تک محیط ہے جس سے رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس سلسلے کی چند اہم کتابوں میں "جدید اردو افسانے کے رجحانات" از ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش، "اردو افسانہ نگاری کے رجحانات" از ڈاکٹر فردوس انور قاضی، "جدید افسانہ" از ڈاکٹر شفیق انجم شامل ہیں۔

x۔ تحقیق کی اہمیت:

اردو ادب کے تحقیقی اور تنقیدی میدان میں افسانے پر کثرت کے ساتھ کام ہوا ہے۔ محققین اور ناقدین نے ادبی فن پاروں کو خوب محنت کے سے پرکھا ہے۔ کئی جدید سے جدید موضوعات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ان جائزوں میں کئی جگہوں پر بہت اعلی پائے کا کام نظر آتا ہے لیکن ان محققین نے اپنے دور کا احاطہ کیا ہے۔ اب اکیسویں صدی میں افسانہ پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ساتھ یہ بھی دیکھنے کی ضرورت ہے کہ آج کے افسانہ نگاروں کے ہاں زیادہ تر کون سے موضوعات نظر آتے ہیں۔ اب ان افسانوں کو روایتی انداز کے بجائے اہم جدید انداز سے دیکھنے کی کوشش کریں گے۔ اس مقالے میں اردو افسانے پر نائن الیون کے اثرات کا جائزہ لیا جائے گا۔ جدید تنقیدی تھیوری تانیثیت کے حوالے سے بھی معاصر افسانے کو دیکھنے کی سعی کی گئی ہے۔۔ اس طرح اس موضوع کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

ب۔ اردو افسانہ:

اردو افسانے دراصل بیسویں صدی کی پیداوار ہے۔ اگر اردو میں قصے، کہانی کی روایت کو دیکھا جائے یہ تو خاصی پرانی ہے۔ اس سے قبل منظوم و منثور داستانوں کی ایک طویل روایت موجود ہے پھر اردو ناول کا آغاز ہوا جوں انسانی فکر نے اگلی سطح پر قدم رکھا تو اردو میں افسانے کی داغ بیل پڑ گئی۔ اس باب میں اردو افسانے کے مختصر پس منظر پر بحث کرتے ہوئے "اردو افسانے" کو اکیسویں صدی کے حوالے سے بھی دیکھا گیا ہے۔ ساتھ ہی 'ادبیات' اور اس کی افسانے کے حوالے سے خدمات پر بھی بحث کی گئی

ہے۔

i۔ اردو افسانے کا مختصر پس منظر:

اردو افسانے کے آغاز کے حوالے سے مختلف محققین نے اپنے اپنے انداز میں مختلف افسانہ نگاروں کے سر اولیت کا تاج باندھا ہے۔ اس سلسلے میں سجاد حیدر یلدرم، پریم چند، راشد الخیری اور سلطان حیدر جوش کے نام لئے جاتے ہیں۔ اس بحث کو ڈاکٹر مسعود خاکی نے اپنی کتاب 'اردو افسانے کا ارتقاء' میں سمیٹتے ہوئے راشد الخیری کو اردو کا پہلا افسانہ نگار ثابت کیا ہے لیکن بعد کے محققین نے دلائل و براہین سے ان کے دعویٰ کی نفی کی ہے۔ جس طرح انشائیے کے آغاز کا قضیہ آج تک حل طلب رہا ہے اس طرح محققین نے افسانے کے آغاز کے حوالے سے بھی بحث کو الجھا دیا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے اپنی کتاب 'اردو ادب کی مختصر تاریخ' میں سلطان حیدر جوش کو بھی اس بحث میں شامل کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "سجاد حیدر یلدرم اور پریم چند کی افسانہ نگاری کی ابتداء تراجم سے ہوئی تھی۔ یلدرم نے ترکی ادب کے افسانے اردو میں منتقل کئے، پریم چند نے ٹیگور کی کہانیاں انگریزی سے ترجمہ کیں، اسی زمانے میں سلطان حیدر جوش کی افسانہ نما تحریریں بھی رسائل میں چھپنا شروع ہو چکی تھیں۔"(۱)

جہاں تک پریم چند کا تعلق ہے ان کا سب سے پہلا افسانہ "دنیا کا سب سے انمول رتن"، ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا جبکہ راشد الخیری کے حوالے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کا افسانہ اس سے پہلے منظر عام پر آیا تھا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر انوار احمد نے لکھا ہے:

> "خوش قسمتی سے میں نے سر عبد القادر کی لائبریری میں مخزن کے ابتدائی برسوں کا فائل دیکھا ہے اس لیے میں وثوق سے کہتا ہوں کہ مخزن میں راشد الخیری کا پہلا مطبوعہ افسانہ "نصیر اور خدیجہ" ہے جو جلد ۶ شمارہ ۳ دسمبر ۱۹۰۳ء کے صفحات ۲۷ تا ۳۱ پر موجود ہے۔"(۲)

ڈاکٹر مسعود خاکی اور ڈاکٹر انوار احمد کی بات مدلل ہے اس لئے ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ اردو کا پہلا افسانہ نگار

راشد الخیری ہے۔ راشد الخیری کو عورتوں کا سر سید کہا جاتا ہے۔ ان کی کہانیوں میں عورت کے مسائل کو واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

سجاد حیدر یلدرم اردو افسانے کا ایک اہم نام ہیں، جنہوں نے اپنے دور میں اردو افسانے کو ایک نئی جہت سے روشناس کروایا تھا۔ انہوں نے اردو میں رومانیت کا بیج بویا۔ سجاد حیدر یلدرم کی افسانوں پر مشتمل کتاب ''خیالستان'' عمدہ کتاب ہے۔ اس میں کچھ افسانے ترکی زبان سے ترجمہ ہیں اور کچھ طبع زاد افسانے ہیں۔ ان کا یہ مجموعہ ۱۹۱۱ء میں منصہ شہود پر آیا تھا۔ اس میں موجود خصوصیات کے حوالے سے ڈاکٹر شفیق انجم نے لکھا ہے ''ان افسانوں میں یلدرم نے جن رومانی رویوں کو پیش کیا ان کی نہ صرف ان کے معاصرین بلکہ بعد میں آنے والوں نے بھی تقلید کی''۔[۳]

پریم چند ردو افسانے کا انمول رتن ہے۔ انہوں نے اردو افسانے کو بیانیہ انداز بخشا، ترقی پسند فکر دی اور دیہاتی پس منظر کا رنگ و روغن ان کے افسانوں میں ہر جگہ نمایاں نظر آتا ہے۔ پریم چند نے اردو ادب کو کئی گرانمایا یہ افسانوں سے نوازا ہے۔ ان کا افسانہ 'کفن' اس قدر مشہور ہوا کہ اردو کے افسانوی ادب کا جھومر نظر آتا ہے۔ ان کی افسانے کے حوالے سے تصانیف میں 'سوز وطن'، 'زادِ راہ'، 'واردات'، 'پریم پچیسی' اور 'پریم بتیسی' اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کے افسانوں کا رنگ اصلاحی ہے۔ انہوں نے اس وقت کے معاشرے میں پائی جانے والی قباحتوں کی بے رحم عکاسی اپنے افسانوں میں کی ہے۔ پریم چند کا اپنا تعلق دیہات سے تھا اس لئے انہوں نے بہت سے افسانے دیہاتی پس منظر میں لکھے ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں کسانوں کے مسائل کو بھی جگہ دی ہے۔ اس حوالے سے ان کے افسانے 'پوس کی رات' اور 'سوا سیر گیہوں' اس طبقے کی افلاس و غربت کو طشت از بام کرتے ہیں۔ پریم چند نے اردو افسانے کو اعتبار بخشا ہے۔ انہوں نے فنی لحاظ سے بھی اعلیٰ پائے کے افسانے ادب کو عطا کئے ہیں۔ انہوں نے 'کفن'، 'دو بیل'، 'زیور کا ڈبہ'، 'حج اکبر' جیسے لافانی افسانے اردو ادب کو عطا کئے ہیں۔ ان کے افسانے 'کفن' کے بارے میں ڈاکٹر انوار احمد نے درست لکھا ہے:

> ''میرا خیال ہے کہ ہر بڑا افسانہ نگار زندگی میں ایک کہانی لکھنے کا خواہاں ہوتا ہے۔ کبھی اس کی تمام کہانیاں اس ایک کہانی کا سایہ بن جاتی ہیں اور کبھی مہ نخشب کی طرح مکمل تخلیق کا التباس یا واہمہ پیدا ہوتا ہے اور کبھی سچ مچ وہ کہانی لکھی ہی جاتی ہے سو 'کفن'

ایسی ہی کہانی ہے۔"(۴)

نیاز فتح پوری بھی رومانوی افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام ہے۔ ان کے افسانوی سرمائے میں 'نگارستان'، 'جمالستان'، 'مختارات نیاز'، 'حسن کی عیاریاں'، 'نقاب اٹھ جانے کے بعد'، 'شہاب کی سرگزشت' اور 'ایک شاعر کا انجام' ہے۔ پہلی چار تصانیف مختصر افسانوں پر محیط ہیں جبکہ 'شہاب کی سرگزشت' اور 'ایک شاعر کا انجام' کو محققین نے ناولٹ کہا ہے۔ نیاز فتح پوری پر بھی سجاد حیدر یلدرم کے اثرات واضح ہیں۔ ان کے اسلوب پر یہ چھاپ نہیں بلکہ یلدرم کی چھاپ ان کے عورت سے متعلق تصورات پر واضح طور پر نظر آتی ہے۔

جہاں پر سجاد حیدر یلدرم کے مقلد پیدا ہوئے وہاں ساتھ ساتھ پریم چند جیسے شہرہ آفاق افسانہ نگار کے مقلد بھی پیدا ہوئے۔ ان میں ایک نام سدرشن کا بھی ہے۔ ان کے افسانوی سرمائے میں 'چشم و چراغ'، 'سدا بہار'، 'قوسِ قزح'، 'طاہر خیال'، 'بہارستان' اور 'پارس' مشہور ہیں۔ انوار احمد نے ان کو محض تاریخی حوالے سے اہمیت دی ہے جبکہ انور سید یدنے اپنی کتاب "اردو ادب کی مختصر تاریخ" میں اردو کے اولین افسانہ نگاروں میں شمار کیا ہے۔ سدرشن نے عورتوں کے جذباتی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ انہوں نے عورتوں کے متعلق زیادہ سنگین مسائل پر قلم نہیں اٹھایا۔

اوپندر ناتھ اشک بھی پریم چند کے مقلدین میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ اثرات ان کے اولین افسانوں پر نظر آتے ہیں بعد میں یہ اثرات نظر نہیں آتے۔ ان کے ہاں صرف ترقی پسندانہ افکار ہی کی بازگشت نہیں بلکہ ان کے ہاں ہمیں رومانیت کی چھاپ بھی نظر آتی ہے۔ انہوں نے نچلے طبقے کو بھی اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔ ان کے بارے میں سلیم آغا قزلباش رقم کرتے ہیں: "اوپندر ناتھ اشک کے افسانوں میں 'ناسور'، 'اُبال'، 'کونپل'، اور 'چٹان' نچلے طبقے کے معاشی و معاشرتی اور جنسی مسائل کی نمایاں تصویریں ہیں۔"(۵)

حیات اللہ انصاری ایک بڑے افسانہ نگار کے روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان کا افسانہ 'آخری کوشش' پریم چند کے کفن کی طرح اَمر ہو گیا اور تخلیق کار کو بھی دوام بخش دیا۔ انہوں نے جاگیر دار طبقے کو اپنی تخلیقات میں موضوع بنایا ہے۔ انہوں نے طبقاتی تضاد کو بھی سامنے لایا ان کے افسانوں میں درد اور کرب کی لہر بھی چھپی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کے متعلق ڈاکٹر انور سید نے بھی لکھا ہے:

"حیات اللہ انصاری نے طبقاتی تضاد کو حقیقی زندگی سے آشکار کیا۔ ان کے افسانوں میں درد اور کرب زیر سطح لہر کی طرح رواں دواں نظر آتا ہے۔ سیارے کی تلاش، انوکھی محبت، موزوں کا کارخانہ اور ڈھائی سیر آٹا میں انصاری ایک بے رحم حقیقت نگار نظر آتے ہیں۔"(۶)

اردو افسانے کی تاریخ کا سب سے معروف نام سعادت حسن منٹو کا ہے۔ انہوں نے اگرچہ کم عمر پائی لیکن جو سرمایہ انہوں نے چھوڑا وہ اردو ادب کی بڑی میراث ہے۔ اردو افسانے میں ریاکاری کا پردہ چاک کرنا، بغاوت پر آمادہ ہو جانا، مزاحمت اور انسانیت کے ساتھ لگاؤ جیسے آداب اردو افسانوں کو منٹو ہی نے عطا کئے ہیں۔ سعادت حسن منٹو کا پہلا افسانہ 'تماشا' تھا جو سانحہ جلیانوالہ باغ کے خونریز واقعہ کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔ منٹو نے اپنے افسانوں میں جنسی حقیقت نگاری کی بے رحم عکاسی کی ہے۔ اس لئے ان کے افسانوں پر مقدمات بھی قائم ہوئے۔

سعادت حسن منٹو کے افسانوں میں بعض افسانے تقسیم کے پس منظر میں بھی لکھے گئے جن میں 'گورمکھ سنگھ کی وصیت' بھی شامل ہے۔ انسانی خون کی ارزانی پر منٹو کڑھتا ہے۔ منٹو نے انگریز سامراج کو بھی پسند نہیں کیا۔ اس حوالے سے ان کا افسانہ نیا قانون بہت معروف ہے۔ یہ اعلیٰ پائے کا افسانہ ہے جس میں ہندوستان کے سیاسی حالات کی بھرپور تصویر ملتی ہے۔ منٹو کے افسانوں میں 'ہتک'، 'ٹوبہ ٹیک سنگھ'، 'کھول دو'، 'ٹھنڈا گوشت'، 'کالی شلوار' اور 'دھواں' وغیرہ بہت مشہور ہوئے۔ ان کی حقیقت نگاری کے بارے میں حمید شاہد نے لکھا ہے: "گر منٹو نے زندگی کی محض کیمرے سے تصویریں نہیں بنائیں۔ اپنے قلم کی نوک کو خنجر بنایا اور حقیقی زندگی پر پڑے دبیز پردوں کو اس کی تیز دھار سے چیر پھاڑ کر ننگا کر دیا۔ یہی سچے تخلیقی تجربے کی دین ہوتی ہے۔"(۷)

کرشن چندر اردو افسانے کا ایک اور نمایاں نام ہے۔ سعادت حسن منٹو اور راجندر سنگھ بیدی جیسے بڑے فنکاروں کی موجودگی میں اپنا نام بنالینا یقیناً بڑی عظمت کی دلیل ہے۔ ان کے افسانے فنی اور فکری دونوں سطحوں پر قاری کی ادبی تسکین کا باعث بنتے ہیں۔

کرشن چندر نے پنجاب اور کشمیر کی سرزمین میں ہوش سنبھالا اس لئے ان کے اکثر افسانوں میں یہ پس منظر نظر آتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان میں پختگی آتی گئی اور ان کے افسانوں میں اس عہد کے معاشی، سیاسی اور سماجی حالات بھی ہمیں نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں اپنے فن کا ایسا جادو جگایا ہے کہ سب ان کے فن کی داد دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ 'ان داتا'، اور 'کچرا بابا' ان کے اعلیٰ پائے کے افسانے ہیں۔ ان پر کوئی ایک لیبل نہیں لگایا جا سکتا وہ ہمہ جہت افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں کی یہی گوناں گوں خصوصیات ہیں جن کے بارے میں ڈاکٹر انوار احمد نے لکھا ہے:

> "کرشن چندر نے سینکڑوں افسانے لکھے ہیں ان میں رومانوی افسانے بھی ہیں اور بے رحم حقیقت نگاری کے مرقعے بھی، ان میں ایسے افسانے بھی ہیں جن پر فارمولا افسانوں کی چھبتی کسی گئی، شاہکار افسانے بھی ہیں، لذتیت کے حامل افسانے بھی اور زندگی کی بصیریت سے مالا مال افسانے بھی ہیں۔"(۸)

اردو افسانے کا ایک اور درخشندہ ستارہ راجندر سنگھ بیدی ہے۔ ان کے افسانوی سرمائے میں 'اپنے دکھ مجھے دو دو'، 'دانہ و دام'، 'گرہن'، 'ہاتھ ہمارے قلم ہوئے'، 'کوکھ جلی' اہم مجموعے ہیں۔ ان کا افسانہ 'اپنے دکھ مجھے دے دو' ایک شاہکار ادبی فن پارہ ہے۔ تقسیم کے پس منظر میں لکھا گیا 'لاجونتی' بھی خاصے کی چیز ہے۔

ایک اور اہم افسانہ نگار غلام عباس ہے۔ 'آنندی' جیسا افسانہ دینے والا یہ فنکار بھی اردو افسانے کی تاریخ میں امر ہو چکا ہے۔ ان کے افسانوی مجموعوں میں 'آنندی'، 'جاڑے کی چاندنی' اور 'کن راس' کافی معروف مجموعے ہیں۔

اگر راشد الخیری کے افسانے 'نصیر و خدیجہ' (مطبوعہ ۱۹۰۳) کو اردو کا پہلا افسانہ مان لیا جائے تو اردو افسانے کی عمر ۱۱۶ برس بنتی ہے۔ اس دوران افسانہ نگاروں کی کہکشاں آسمان ادب پر چمکی۔ اس مختصر پس منظر میں ہم نے محض چند افسانہ نگاروں کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ اردو میں افسانہ نگاروں کی ایک طویل فہرست ہے جس کے لئے الگ باب درکار ہے بلکہ محققین نے اس پر کافی لکھا ہے۔ 'اردو افسانے کی روایت' اور 'اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ' اردو افسانے کی کی جامع تواریخ کہی جا سکتیں ہیں۔ ان کتب کو اردو افسانے کا تذکرہ کہنا چاہئے۔ اب مختصر پس منظر کے بعد اکیسویں صدی کے افسانے کو دیکھنا بھی ضروری ہے۔

ii۔ اردو افسانہ اکیسویں صدی میں:

وقت اور حالات کی تبدیلی ادب کے سمندر میں بھی تغیر برپا کرتی ہے۔ جب یہ کہتے ہیں کہ ادب اپنے عصر کا ترجمان ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ ادب کا رشتہ وقت کے ساتھ جوڑ کر کسی معاشرے میں رونما ہونے والے تغیرات اور اس کے اثرات ادب پر دیکھے جاتے ہیں۔ ادیب حساس دل و دماغ کا مالک ہوتا ہے۔ وہ گہرا مشاہدہ کرتا ہے۔ لالہ و گل سے کلام پیدا کرنا اس کی فطرت میں موجود ہوتا ہے۔ زندگی کے کسی معمولی سے تجربے اور مشاہدے میں آنے والی بات میں ادیب رنگ آمیزی کر کے اس کے اثر کو دوچند کر دیتا ہے۔ اس طرح نئی صدی کا تخلیق کار بھی مندرجہ بالا تمام خصائص کا حامل ہے۔

جب ہم اکیسویں صدی میں اردو افسانے کی بات کرتے ہیں تو اس وقت ہمارے سامنے کچھ پختہ اور کہنہ مشق افسانہ نگار نظر آتے ہیں۔ ساتھ نئے افسانہ نگار بھی ابھرتے ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اگلی صفوں میں جگہ بناتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ پہلے ان افسانہ نگاروں کا تذکرہ ہو گا جو کہ بیسویں صدی ہی میں مشہور ہو چکے تھے بلکہ ان کا اصل تخلیقی کام بیسویں صدی میں ہی سامنے آ چکا تھا لیکن وہ اکیسویں صدی میں بھی زندہ تھے اور کچھ نہ کچھ انہوں نے تخلیق بھی کیا۔ اس حصے میں اکیسویں صدی کے نمائندہ افسانہ نگاروں کا اجمالی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

اکیسویں صدی کے پاکستانی اردو افسانے کی بحث کی جائے تو بلحاظ مصنفین انتظار حسین کا نام سرفہرست نظر آتا ہے۔ انہوں نے ۲ فروری ۲۰۱۶ء کو وفات پائی۔ اکیسویں صدی کی ابتداء ہی میں ان کا افسانوی مجموعہ 'شہرزاد کے نام' سنگ میل پبلی کیشنز سے ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا۔ جس میں سترہ افسانے شامل ہیں۔ معروف افسانہ 'مورنامہ' اسی میں شامل ہے۔ ان کے فن میں مسلسل ارتقاء نظر آتا ہے:

"انتظار حسین کا فن مسلسل آگے بڑھتا رہا ہے۔ تازہ افسانوں میں نئے اسالیب اور نئے انداز دیکھنے کو ملتے رہے ہیں جیسے مصنف نامعلوم کی دنیا میں آگے بڑھتا جا رہا ہے۔"(۹)

اس کے بعد ۲۰۱۲ء میں بھی ان کا افسانوی مجموعہ 'زمین اور فلک اور' شائع ہوا۔ اس طرح پچھلی صدی کا بڑا افسانہ نگار نئی صدی میں بھی سرگرم عمل نظر آتا ہے۔

اسد محمد خان (پ: ۱۹۳۲) ایک اہم افسانہ نگار ہیں۔ ان کا کام اکیسویں صدی میں بھی خاصی مقدار

میں سامنے آیا ہے۔ 'نربدا اور دوسری کہانیاں' ۲۰۰۳ء، 'جو کہانیاں لکھیں' ۲۰۰۵ء (کلیات)، 'تیسرے پہر کی کہانیاں' ۲۰۰۶ء، 'ایک ٹکڑا دھوپ کا'، ۲۰۱۰ء، 'ٹکڑوں میں کہی گئی کہانیاں' ۲۰۱۶ء میں سامنے آئیں۔ اس طرح انہوں نے اکیسویں صدی میں جم کر افسانے لکھے۔ ان کے بارے میں مرزا حامد بیگ نے لکھا ہے:

> "اسد محمد خان کی افسانہ نگار کا آغاز۔۔۔ 'باسودے کی مریم' اور 'لے 'للاللہ' لکھ کر بیک وقت عجز اور غصے کی انتہائی صورتوں کے اظہار سے ہوا ہے۔ دراصل اسد محمد خان کے افسانوں کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔"(۱۰)

خالدہ حسین بھی اکیسویں صدی کی ایک اہم افسانہ نگار ہیں۔ حال ہی میں ان کی وفات ۱۱ جنوری ۲۰۱۹ء کو ہوئی۔ ان کی افسانوں کی پہلی کتاب 'پہچان' ۱۹۸۱ء میں منصہ شہود پر آئی۔ جہاں تک اکیسویں صدی کی بات ہے تو ان کی کتاب 'میں یہاں ہوں' ۲۰۰۵ء میں شائع ہوئی۔ اس بارے میں بی بی آمنہ نے لکھا ہے۔ "'میں یہاں ہوں' خالدہ حسین کا پانچواں اور اب تک کا آخری افسانوی مجموعہ ہے جو ۲۰۰۵ء میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور کی وساطت سے ادبی افق کی زینت بنا۔(۱۱)

خالدہ حسین کو علامتی افسانہ نگار کی حیثیت سے شہرت حاصل ہوئی۔ ان کا علامتی رجحان بے ساختہ ہے وہ جان بوجھ کر علامتی انداز نہیں بلکہ ان کا یہ انداز فطری طور پر موجود رہتا ہے۔

الطاف فاطمہ بھی اکیسویں صدی کی اہم افسانہ نگار ہیں۔ ان کا انتقال نومبر ۲۰۱۸ء کو ہوا۔ ان کے افسانے بھی شروع کے کچھ سالوں میں ادبی پرچوں کی زینت بنے۔ تاہم ان کا زیادہ کام بیسویں صدی ہی میں منظر عام پر آچکا تھا۔ "ان کے افسانوں میں عام طور پر احساس تنہائی، ملال اور صنفی معاشرت کا عکس ملتا ہے۔"(۱۲)۔ ان کے ہاں اکیسویں صدی کے مخصوص مسائل کا حوالہ بھرپور انداز میں ملتا ہے۔

منشا یاد بھی ایک اہم افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ بھی ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا۔ 'خواب سرائے' منشا یاد کے افسانوں کا آٹھواں مجموعہ ہے جو دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد سے خالد رشید کے سرورق کے ساتھ ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا۔(۱۳)۔ منشا یاد کا افسانہ 'تماشا' ایک ایسا افسانہ ہے جس کو اردو کے مشہور افسانوں میں رکھا جا سکتا ہے۔ ان کی کہانیوں کا انداز بیانیہ ہے۔ کہانی کا عنصر ان کے افسانوں میں موجود ہے۔ اس بارے میں محمد حمید شاہد نے لکھا ہے: "منشا یاد نے مسلسل لکھا اور ہر طرح کی کہانی لکھی تاہم خالص اور سیدھے،

سادے بیانے کی کہانی مرغوب رہی۔"(۱۴)

رشید امجد بقید حیات افسانہ نگار ہیں۔ ان کے کئی افسانوی مجموعے بیسویں صدی میں شائع ہوئے۔ ان کا افسانوی مجموعہ 'ایک عام آدمی کا خواب' ۲۰۰۶ء میں منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے میں اکیس افسانے شامل ہیں اور آخر میں ایک مضمون 'میں اور میرے کردار' کے عنوان سے شامل ہے۔ رشید امجد کے کلیات کا نام بھی 'عام آدمی کے خواب' ہے۔ دراصل انہوں نے برائے نام عام آدمی کا نام نہیں دیا بلکہ ان کے کردار بھی اسی طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں:ر"رشید امجد نے اپنے افسانوں کو عام آدمی کی زندگی دی ہے۔ یہ کردار ہر عہد، ہر علاقے اور ہر معاشرے کا لازمہ رہا ہے۔"(۱۵)

رشید امجد کے ہاں وہ بیانیہ انداز نہیں ہے جو کہ منشایاد کا خاصا ہے۔ ان کے ہاں علامتی اور تجریدی انداز نمایاں ہے۔ علامت دراصل سیاسی حالات کی پیداوار ہے۔ بیانیہ انداز کو بعض افسانہ نگاروں نے کلیشے قرار دیا اور تجریدی انداز کو اپنایا۔ اس بارے میں ڈاکٹر شفیق انجم نے لکھا ہے:

> "رشید امجد کی اکثر کہانیاں علامتی و تجریدی ہیں۔ یہاں واقعہ کے بجائے خیال زیادہ اہم ہے اور خیال کی مضبوط گرفت ہی افسانے کا پلاٹ مرتب کرتی ہے۔ کردار زیادہ تر بے نام ہیں اور عام طور پر صیغہ واحد متکلم وغائب کے استعمال سے کردار سازی کا کام لیا جاتا ہے۔"(۱۶)

سمیع آہوجہ کا افسانوی مجموعہ بھی ۲۰۰۲ء میں 'قید در قید' کے عنوان سے چھپا تھا۔ وہ بھی ہمارے عہد کا ایک بڑا افسانہ نگار ہے۔

حسن منظر معالج بھی ہیں اور بڑے افسانہ نگار ہونے کے ساتھ اعلیٰ پائے کے ناول بھی تخلیق کر چکے ہیں۔ سماج میں بکھری ہوئی کہانیوں کو انہوں نے گہرے مشاہدے اور کمال چابکدستی سے سمیٹا ہے۔ ان کے کئی افسانوی مجموعے سامنے آ چکے ہیں۔ ۲۰۱۵ء میں ان کا مجموعہ 'جھجھک' شائع ہوا جس کو شہروز پبلی کیشنز نے شائع کیا۔ ان کے افسانوں میں عصر حاضر کے مسائل اور خاص کر نوجوانوں کے نفسیاتی اور جنسی مسائل کو خوبصورت انداز میں دیکھا جا سکتا ہے۔ دراصل ان کا تجربہ اور مشاہدہ گہرا ہے۔ اس بارے میں حمید شاہد بھی اقرار کرتے ہیں:

"اسے زندگی کا جو تجربہ حاصل ہوا اور جو کچھ اس کے مشاہدے میں آیا، اس سے اس کے ہاں موضوعات کا تنوع، منظر میں وسعت اور ہر قبیل اور طبقے کے کردار آتے چلے گئے۔"(۱۷)

مہرونہ لغاری نے ان کے فن اور شخصیت پر ایک جامع اور مبسوط مقالہ بھی لکھا جو کتابی صورت میں سامنے آچکا ہے۔

آصف فرخی نے بھی ادب کی مختلف میدانوں میں خدمت کی ہے۔ انہوں نے تراجم، تنقید اور ادارت کے علاوہ اردو افسانے میں بھی کام کیا ہے۔ ان کا افسانوی مجموعہ 'میرے دن گزر رہے ہیں'۔ ۲۰۰۸ء میں سامنے آیا اس میں بیس افسانے شامل ہیں۔ اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر انوار احمد نے لکھا ہے: ا"س کے تازہ ترین مجموعے 'میرے دن گزر رے ہیں' کا انداز سوانحی ہے، بیشتر افسانوں کے متکلم سے اپنی ذات مشابہت کو اس نے چھپانے کی کوشش نہیں کی بلکہ منٹو کی طرح کھل کر اپنا نام لیا اور کوائف بتائے۔(۱۸)

مرزا حامد بیگ نقاد کے ساتھ ساتھ ایک محقق اور بڑے افسانہ نگار بھی ہیں۔ انہوں نے اردو افسانے کی تاریخ پر بڑا دقیع کام کیا ہے۔ نئی دہائی کے آغاز کے ساتھ ہی ان کا مجموعہ 'گمشدہ کلمات' منظر عام پر آیا۔ جس میں گیارہ افسانے ہیں یہ ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا۔ ۲۰۱۱ء ان کا افسانوی مجموعہ 'جانکی بائی کی عرضی' سامنے آیا۔ اس میں دس افسانے شامل ہیں۔ مرزا حامد بیگ دور حاضر کے اہم تخلیق کار ہیں۔ ان کے بارے میں فضیل جعفری نے 'جانکی بائی کی عرضی' کے ابتدائیے میں لکھا ہے:

"پچھلے پچیس، تیس سال کے دوران پاکستان میں جو چار درجن کے قریب نہایت عمدہ اور دقیع اور دیرپا اثرات کے حامل افسانے لکھے گئے ہیں ان میں کچھ بہترین اور حد درجہ متاثر کرنے والی کہانیاں مرزا حامد بیگ کی تخلیق کردہ ہیں۔"(۱۹)

مبین مرزا کی افسانہ نگاری کا آغاز بھی بیسویں صدی میں ہو چکا تھا تاہم ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'خوف کے آسمان تلے' ۲۰۰۴ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ انہوں نے عصری آشوب کو اپنی کہانیوں کے خام مال کے طور پر استعمال کیا ہے۔

بشریٰ رحمن نے بھی ناولوں کے ساتھ ساتھ ہمیں افسانے بھی عطا کئے۔ 'چُپ' ان کا افسانوی مجموعہ ہے جو ۲۰۰۶ء میں منصہ شہود پر آیا۔ اس میں گیارہ افسانے ہیں اور باقی افسانچے۔ اس کا دیباچہ ڈاکٹر سلیم اختر نے 'چُپ کی داد' کے عنوان سے لکھا ہے۔: ا"گر بشریٰ رحمن کے افسانوی فن کی اساس دریافت کرنا چاہیں تو یہ کارِ دشوار ثابت ہو گا اس لئے کہ اس نے شعوری طور پر خود کو کسی نظریہ، تصور یا کلیشے کا پابند نہیں کیا۔"(۲۰)

انور زاہدی اکیسویں صدی کے ایک اہم افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانے رسائل و جرائد میں نظر آتے ہیں۔ ۲۰۰۸ء میں ان کا مجموعہ 'مندر والی گلی' شائع ہوا۔ انہوں نے رشید امجد اور خالدہ حسین کی طرح علامتی انداز سے افسانے کی کہانی کو بیان کیا۔ ان کے ہاں گہرا مشاہدہ ہمیں دکھائی دیتا ہے۔ وہ اپنے عہد کا عصری شعور رکھتے ہیں۔ ان کے بارے میں خاور نقوی نے لکھا ہے:

> "انور زاہدی نے علامتی انداز میں سماجی و سیاسی مسائل کو پیش کیا ہے۔ انہوں نے ان مسائل کی پیشکش میں مہارت سے کام لیا ہے۔ ان افسانوں کے مطالعے سے ایسا لگتا ہے کہ ان میں سے بعض مسائل ان کا ذاتی تجربہ اور بعض ان کے گہرے مشاہدے میں آئے ہیں۔"(۲۱)

علی تنہا بھی عصر حاضر کے ایک اہم افسانہ نگار ہیں۔ ان کا ایک افسانوی مجموعہ 'بھول کی گھنٹیاں' ۲۰۱۱ء میں شائع ہوا۔ اس میں مجموعی طور پر بیس افسانے ہیں۔ یہ سانجھ پبلی کیشنز لاہور نے شائع کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں سیدھے سادے انداز کی بجائے علامتی انداز ہے۔ اس بارے میں ڈاکٹر انوار احمد نے بھی لکھا ہے:"اس کے افسانوں میں واقعات، مربوط اور ٹھوس شکل میں پیش نہیں ہوتے بلکہ ویرانی اور تنہائی کا کچھ سناٹا دھواں دھواں تاثر پیدا کرتا ہے۔"(۲۲)

مسعود مفتی نے بھی نئی صدی میں افسانے کی طرف توجہ دی۔ ان کا افسانہ شناخت جو کہ نائن الیون کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ بہت مشہور ہوا ہے۔ یہ ۲۰۰۲ء میں فنون میں شائع ہوا۔ ان کے اس افسانے کے بارے میں مقصودہ حسین نے لکھا ہے:

> ""شناخت' کہانی ہے ان دو افراد کی جو بہتر مستقبل کی خاطر مغرب کا رخ کرتے ہیں۔

وہاں کی آسودگی سے متاثر ہو کر وہیں کے ہو رہتے ہیں۔ وہیں شادی کرتے ہیں اور اپنے بچوں کی پرورش کرتے ہیں۔"(۲۳)

"توبہ" مسعود مفتی کی تصنیف ہے۔ جو ۲۰۰۶ء میں منظر عام پر آئی۔

ہمارے عہد میں افسانے کی ایک نسوانی آواز شمع خالد کی صورت میں موجود ہے۔ شمع خالد کا تعلق راولپنڈی سے ہے۔ انہوں نے بھی خوب جم کر لکھا ہے۔ نئی صدی میں ان کی دو تصانیف سامنے آچکی ہیں۔ 'گمشدہ لمحوں کی تلاش' مجموعہ ۲۰۰۳ء میں جبکہ 'بند ہونٹوں پہ دھری کہانیاں' ۲۰۰۷ء میں شائع ہوا۔ شمع خالد فطری ادیبہ ہیں۔ انہوں نے ادب کو زندگی کا لازمہ سمجھ رکھا ہے۔ اس لئے انہوں نے اردو کو لگ بھگ ۲۰۰ کے قریب کہانیاں عطا کی ہیں۔

عصر حاضر کے افسانہ نگاروں میں ایک نمایاں نام محمد حمید شاہد کا ہے۔ ان کے ہاں صرف تخلیق کار کی خوبیاں موجود نہیں ہیں بلکہ وہ ایک ذہین نقاد بھی ہیں۔ اکیسویں صدی میں ان کا افسانوی مجموعہ 'مرگ زار' ۲۰۰۶ء میں بازیافت اکادمی کراچی سے شائع ہوا۔ اس میں ان کے پندرہ افسانے شامل ہیں۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت کہ نائن الیون کے پس منظر میں لکھی گئی کہانیاں اسی مجموعے میں شامل ہیں۔ اردو افسانے کی تنقید کے حوالے سے ان کی کتاب 'اردو افسانہ صورت و معنی' بہت عمدہ تنقیدی کتاب کہی جاسکتی ہے۔ نو آموز لکھاری کی تربیت کے لئے بڑی جامع کتاب ہے۔

بلوچستان کی رنگ و بو کو اپنے افسانوں میں سمونے والا ایک افسانہ نگار آغا گل بھی ہے۔ ان کے افسانوں میں بلوچستان کی تہذیبی و ثقافتی فضا پوری طرح رچی بسی ہوئی ہے۔ مشہور مدیر سیپ (نسیم درانی) نے انہیں بلوچستان کا پہلا اور آخری افسانہ نگار قرار دیا۔ ان کا آخری مجموعہ ۲۰۱۲ء میں 'پرندہ' کے نام سے سامنے آیا۔ مجموعی طور پر ان کے سات افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی افسانہ نگار کے بارے میں فیصل احمد گوندل نے لکھا ہے:

"آغا گل ایسے افسانہ نگار ہیں جن کی تحریر کی پہچان مقامیت اور علاقائیت اور ان کے افسانوں میں بلوچستان کی ثقافت و معاشرت، طاقت، عنصر اور اثر انگیزی کے ساتھ ابھرتی ہے۔"(۲۴)

خالد فتح محمد ایک اہم ناول نگار اور افسانہ نگار ہیں۔ ان کے کئی افسانوی مجموعے نئی صدی میں شائع ہوئے۔ 'داغ داغ اجالا' ۲۰۰۳ء، 'جمع تقسیم' ۲۰۰۴ء اور 'پانچ منٹ کی زندگی' ۲۰۰۵ء میں سامنے آئے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں دیہی معاشرت کی عکاسی کی ہے۔ سہ ماہی ادبیات میں ان کے افسانے باقاعدگی سے شائع ہوتے ہیں۔

طاہرہ اقبال معاصر افسانے کی ایک توانا آواز ہیں۔ ان کے کئی افسانوی مجموعے نئی صدی کے دوران شائع ہوئے۔ گنجی بار ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا۔ اس کا پیش لفظ اسد محمد خان نے لکھا ہے۔ اس میں چوبیس افسانے شامل ہیں۔

> "اردو میں دیہات کو۔۔۔۔۔پنجاب کے دیہات کو بہت سوں نے لکھا اور خوب لکھا ہے لیکن طاہرہ اقبال کا دیہات (شاید گنجی بار کا علاقہ) تیز و تند چشمے کی طرح مٹی سے پھوٹتا ہے۔"(۲۵)

طاہر اقبال کا ایک اور افسانوی مجموعہ 'ریخت' ہے جو ۲۰۱۱ میں منظر عام پر آیا جس میں اٹھارہ افسانے شامل ہیں۔ 'سنگ بر' بھی افسانوں کا مجموعہ ہے یہ ۲۰۱۳ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ اس طرح طاہرہ اقبال اکیسویں صدی میں اردو میں افسانے کی توانا آواز کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہیں۔

اکیسویں صدی کے افسانے کا اجمالی جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ افسانہ اب بھی بہت لکھا جارہا ہے۔ جن افسانہ نگاروں کا تذکرہ کیا گیا وہ اب ادبی سطح پر نمایاں ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ افسانہ نگاروں کی ایک کہکشاں ادبی افق پر ستارہ بن کر چمکنے کو تیار ہے۔ ان میں زیف سید، شاہین کاظمی، کرن شفقت، زیب اذکا حسین، ڈاکٹر احمد حسن رانجھا، معظمہ تنویر، عطیہ سید، عاصم بٹ، فارس مغل، سید کاشف رضا، فردوس انور قاضی، سیمیں کرن وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔

ج۔ سہ ماہی 'ادبیات' اسلام آباد :

i۔ اکادمی ادبیات پاکستان مختصر تعارف:

ہر قوم اور ملک اپنی زبان کے فروغ کے لئے مختلف لائحہ عمل طے کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں پاکستان

میں بھی کوششیں کی گئی ہیں۔ انجمن ترقی اردو جو ۱۹۰۳ء میں قائم ہوئی وہ اب بھی کراچی میں فعال نظر آتی ہے۔ اردو ادب کے کلاسیکی نقوش کی بازیافت کے لئے مجلس ترقی ادب لاہور بھی متحرک نظر آتی ہے۔ اسلام آباد میں ادارہ فروغ قومی زبان (پرانا نام مقتدرہ قومی زبان) بھی اردو کو جدید علوم کی زبان بنانے کے لئے کوشاں ہے۔ اردو کی جامع لغت تیار کرنے کے لئے بنایا گیا بورڈ 'اردو و لغت بورڈ' بھی مقاصد کے حصول کے لئے سرگرداں نظر آتا ہے۔ ایسا ہی ایک ادارہ اکادمی ادبیات پاکستان کا قیام جناب ذوالفقار علی بھٹو کی وزارت عظمیٰ کے دور میں وفاقی وزارت تعلیم کے تحت ایک خود مختار ادارے کی حیثیت سے یکم جولائی ۱۹۷۶ء کو عمل میں آیا۔[۲۶]

> "ایک سال قبل یعنی ۱۹۷۵ میں اکادمی ادبیات کے اغراض و مقاصد کا تعین کیا گیا اور اس کے لئے اساسی اراکین کا انتخاب کر لیا گیا تھا۔ ڈاکٹر شفیق الرحمن، اکادمی ادبیات کے پہلے چیئرمین مقرر ہوئے۔"[۲۷]

آج کل سید جنید اخلاق ڈائریکٹر جنرل کے عہدے پر فائز ہیں۔ راشد حمید آج کل ناظم اعلیٰ ہیں۔ چیئرمین کے منصب پر اس سے قبل اعلیٰ ادبی شخصیات فائز رہی ہیں۔ جن میں پروفیسر بی جے پریشان خٹک (۱۹۸۶ء تا ۱۹۸۹ء)، احمد فراز (۱۹۸۹ء تا ۱۹۹۰ء)، جناب غلام ربانی اے اگرہ (۱۹۹۰ء تا ۱۹۹۳ء)، فخر زمان (۱۹۹۴ء تا ۱۹۹۷ء)، نذیر ناجی (۱۹۹۷ء تا ۱۹۹۹ء)، آفتاب احمد شاہ قائم مقام (۱۹۹۹ مارچ سے دسمبر ۱۹۹۹ء)، مرزا محمد مشیر قائم مقام (۱۹۹۹ء تا ۲۰۰۰ء)، افتخار عارف (۲۰۰۰ء تا ۲۰۰۸ء)، فخر زمان (۲۰۰۸ء تا ۲۰۱۰ء)، عبدالحمید (۲۰۱۲ء تا ۲۰۱۴ء) شیراز لطیف نگران اضافی (۲۰۱۴ء تا ۲۰۱۵ء)، پروفیسر ڈاکٹر قاسم بگھیو (۲۰۱۵ء تا ۲۰۱۸ء)، عبدالحمید خان نیازی (۳ مارچ ۲۰۱۸ء تا ۶ مئی ۲۰۱۸ء) جنید اخلاق (۲۰۱۸ء سے تاحال)۔ اس طرح ادبیات میں بڑے بڑے ادباء نے کام کیا ہے۔ انہوں نے اس ادارے کے فروغ کے لئے تندہی سے اپنے فرائض انجام دیئے ہیں۔

اس وقت اکادمی کے لئے جو مقاصد طے کئے گئے ہیں ان میں پاکستانی زبانوں اور ادب کے فروغ کے لئے اہل قلم کی فلاح و بہبود کے لئے اقدامات کرنا، پاکستانی زبانوں اور ادب کے فروغ کے لئے اہل قلم برادری کی فلاح و بہبود سے متعلقہ پالیسی پر وفاقی حکومت کو مشاورت فراہم کرنا، زبان و ادب کے شعبوں میں تحقیقاتی

منصوبوں کی ترجیحات کی سمت متعین کرنا، ادب کے فرروغ کے لئے سرگرم اداروں کی نگرانی اور ان کی مالی معاونت کرنا، نظریہ پاکستان سے ہم آہنگ ادب کی اشاعت کے اقدامات، مختلف ادبی انعامات کے لئے مستحقین کا تعین، زبان و ادب سے متعلقہ بین الاقوامی اجلاسوں میں وفاقی حکومت کی نمائندگی کرنا، حاجت مند اہل قلم کی مالی امداد کرنا، ادبی تحریروں کی طباعت اور اشاعت میں معاونت فراہم کرنا، پاکستانی زبانوں اور ادب کی ترویج اور ملک میں اہل قلم کی فلاح و بہبود سے متعلق وفاقی حکومت کی طرف سے تفویض کردہ کسی بھی سرگرمی کو انجام دینا۔ اکادمی ادبیات اپنی منشور پر عمل پیرا ہو کر قومی یکجہتی کے فروغ کے لئے اپنے تئیں کوشاں ہے:

> "اکادمی کے منشور میں یہ بات شامل ہے کہ قومی یکجہتی کو فروغ دیا جائے، اس سلسلے میں اکادمی ادبیات پاکستان کی خدمات قابل ستائش ہیں کہ اس نے پاکستانی زبانوں کی ترویج و اشاعت کے ساتھ ساتھ نامور علمی و ادبی شخصیات کے بین الصوبائی دوروں کا بھی اہتمام کرتی ہے۔ اس طرح اہل قلم کے خیالات سے تمام لوگوں کو مستفید ہونے کا موقع بھی ملتا ہے اور قومی یکجہتی کا تاثر بھی ابھر کر سامنے آتا ہے۔"(۲۸)

اکادمی ادبیات پاکستان، پاکستانی زبانوں اور ادب کے فروغ کے لئے مختلف کتب بھی باقاعدگی سے شائع کرتی ہے۔ اس میں تحقیقی، ملکی ادب کے اردو میں تراجم، غیر ملکی زبانوں کے تراجم اور پاکستانی ادب کے معمار وغیرہ اہم کتابی سلسلے ہیں۔ مختلف اوقات میں ادبی سرگرمیاں، کانفرنسز، نمائشوں اور سیمینار وغیرہ کا انعقاد بھی کیا جاتا ہے۔

ادیبوں کی فلاح و بہبود کے لئے مختلف ایوارڈ جن میں 'کمال فن ایوارڈ'، 'قومی ادبی ایوارڈ' 'شاہ عبداللطیف بھٹائی اور تصوف ایوارڈ' سے بھی معیار پر پورا اترنے والوں کو نوازا جاتا ہے۔

اکادمی ادبیات کے کارناموں کے بیان کے لئے ایک الگ باب درکار ہے۔ بہرحال یہ ادارہ کثیر الجہاتی ادارہ ہے۔ اس نے پاکستانی زبانوں اور اردو کے فروغ کے لئے گراں قدر کام کیا ہے۔ مزید ترقی کے امکانات روشن ہیں۔ بلاشبہ اکادمی ادبیات نے اپنے حصے کی شمع جلا کر رکھی ہوئی ہے۔

ii۔ سہ ماہی 'ادبیات': تعارف:

سہ ماہی 'ادبیات' اکادمی ادبیات پاکستان کے زیر اہتمام شائع ہونے والا ادبی پرچہ ہے۔ سہ ماہی 'ادبیات' کا پہلا شمارہ جولائی ۱۹۸۷ء میں منظر عام پر آیا تھا۔(۲۹)

ادبیات ایک خالص ادبی پرچہ ہے۔ یہ اولین شمارے سے اب تک باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ ابھی مارچ میں اس کا شمارہ نمبر ۱۱۸ منظر عام پر آیا ہے۔ یعنی اس کے اب تک ۱۱۸ شمارے منظر عام پر آچکے ہیں۔ اس میں اردو ادب کے ساتھ ساتھ مقامی زبانوں سندھی، بلوچی، پنجابی، سرائیکی، ہندکو، پشتو، کشمیری، شنا، بلتی اور براہوی وغیرہ میں شائع ہونے والے ادب کے تراجم بھی شائع ہوتے ہیں اس طرح 'ادبیات' اردو کے ساتھ ساتھ مقامی زبانوں کے فروغ کے لئے بھی سرگرم ہے۔ اس پرچے نے تمام زبانوں کے ادب کو قاری تک پہنچانے کا فریضہ اچھے انداز سے نبھایا ہے۔ ادبیات میں دو طرح کے نمبرز شائع ہوتے ہیں جن میں موضوعاتی نمبرز اور شخصی نمبرز دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان کا تذکرہ 'ادبیات' کی خدمات کے ذیل میں آئے گا۔ یہ ایک ایسا پرچہ ہے جس میں ملک کے تمام ادباء کو نمائندگی دی جاتی ہے۔

اردو کے ساتھ ساتھ پاکستان کی علاقائی زبانوں میں لکھنے والوں کو بھی اس پرچے نے متعارف کروایا ہے۔ اس میں ملک کے تمام حصوں کو بھی نمائندگی دی جاتی ہے۔ ادبیات کو ایک ہمہ گیر پرچہ کہا جاسکتا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ تیمور اختر کے بیان سے ہوتا ہے:

> "اکادمی دبیات کا مجلہ 'سہ ماہی ادبیات' ایک اہم علمی و ادبی کاوش ہے۔ جس کی جتنی بھی توصیف کی جائے کم ہے۔ سہ ماہی ادبیات میں شامل مضامین تخلیقی کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ مجلے کو صراط مستقیم پر رکھنے اور معیار کو بہتر بنانے کے لئے ضروری ہے۔"(۳۰)

'ادبیات' کو ہمیشہ سے بھرپور ادبی شخصیات کی ادارت میسر آئی۔ سہ ماہی ادبیات کی مختلف ادباء نے ادارت کی جن میں پہلے مدیر خالد اقبال یاسر (۱۹۸۷ء تا ۲۰۰۰ء)، دوسری نگہت سلیم (۲۰۰۰ء تا ۲۰۰۶ء)، تیسرے محمد عاصم بٹ (۲۰۰۶ء تا ۲۰۱۴ء) اور چوتھے اختر رضا سلیمی (۲۰۱۶ء تا حال) ہیں۔ مندرجہ بالا مدیران کے علاوہ بعض دفعہ مہمان مدیر، مدیر اعلی اور مدیر منتظم کے طور پر مختلف لوگوں کے نام اس پر چھپتے رہے۔

iii۔ سہ ماہی 'ادبیات': خدمات :

سہ ماہی "ادبیات" کے پیش نظر جو مقاصد پہلے دن سے رہے وہ ان معیارات پر پورا اترتا ہے۔ دراصل اکادمی ادبیات کے منشور کا یہ پرچہ حصہ تھا۔ اس بارے میں پہلے شمارہ میں واضح درج ہے: "ادبیات کا پہلا شمارہ آپ کے سامنے ہے۔ ایک ادبی اور تحقیقی صحیفے کا اجراء اکادمی ادبیات پاکستان کے اساسی منشور میں شامل تھا۔"(۳۱)

دراصل اس پرچے کی تخلیقی اور تحقیقی حوالے سے خدمات بہت اہم ہیں۔ ذیل میں ہم یہی دیکھیں گے کہ یہ پرچہ کس قدر کامیاب رہا ہے۔

سب سے پہلے ادبیات نے موضوعاتی حوالے سے جو خاص شمارے شائع کئے ہیں ان پر گہری نظر ڈالی جائے تو عالمی ادب نمبر (چھ جلدیں)، سارک نمبر تین جلدیں، نثری نظم نمبر، پاکستانی اہل قلم خواتین کا خصوصی شمارہ اور انتخاب خواتین کا عالمی ادب نمبر شامل ہیں۔

اگر ادبیات کے 'بین الاقوامی ادب نمبرز' کو دیکھا جائے تو یہ اپنے آپ میں دوسرے ممالک کے ادب کو اردو اور پاکستانی قارئین تک پہنچانے کی ایک اہم کوشش ہے۔ ادبیات کا پہلا، عالمی ادب نمبر ۱۹۹۶ء میں سامنے آیا۔ اس میں ارجنٹائن، آسٹریلیا، آئرلینڈ اور اٹلی کے تخلیقی کاروں کے تراجم شامل ہیں۔ دوسرا بین الاقوامی ادب نمبر دسمبر ۱۹۹۶ء میں منظر عام پر آیا۔ اس میں ایران، برازیل، برطانیہ، بلغاریہ، بنگلہ دیش اور بھارت کے تخلیق کاروں کی تخلیقات تراجم کی شکل میں پیش کی ہیں۔ تیسرا بین الاقوامی ادب نمبر جولائی ۱۹۹۷ء میں سامنے آیا۔ اس میں پولینڈ، پیراگوئے، تاجکستان، ترکی، تھائی لینڈ، جاپان، جارجیا، جنوبی افریقہ، جنوبی کوریا کے تخلیق کاروں کے ادب پاروں کے تراجم پیش کئے گئے ہیں۔ اس میں پاپلو نیرووا کے حوالے سے خصوصی گوشہ قائم کیا گیا ہے۔ چوتھا عالمی ادب نمبر جو دسمبر ۱۹۹۷ء میں منصہ شہود پر آیا اس میں سعودی عرب، سنگاپور، سوڈان، زمبابوے، سپین، چین، ڈنمارک اور روس کے ادباء کے فن پاروں کے تراجم شامل ہیں۔ پانچواں بین الاقوامی نمبر جولائی ۱۹۹۸ء میں سامنے آیا۔ چھٹا دسمبر ۱۹۹۸ء میں سامنے آیا۔ اس طرح ان نمبرز کے ذریعے ہم ادبیات کے توسط سے عالمی ادب اور اس کے لکھاریوں سے بھی واقفیت حاصل کر لیتے ہیں۔ بلاشبہ یہ ایک بڑی ادبی خدمت ہے۔

اب بات کریں ادبیات کے شخصیات نمبرز کی تو اس سلسلے میں 'امریتا پریم نمبر' اکتوبر ۲۰۰۹ء تا مارچ ۲۰۱۰ء کے عرصے پر محیط ہے۔ امریتا پریتم کے بارے میں یہ نمبر اعلیٰ پائے کی دستاویز ہے۔ امریتا پریتم پر تحقیق کرنے والے اس سے کبھی بھی چشم پوشی نہیں کر پائیں گے۔ خاص طور پر موصوفہ پر لکھے گئے اردو مضامین سدا بہار ہیں۔ اس کے بعد دوسرا گوشتہ ان کے بارے میں پنجابی مضامین کا ہے۔ ان کے انتساب کی گئی نظموں کا انتخاب بھی شامل اشاعت ہے۔ اس کے بارے میں فخر زمان نے لکھا ہے: "ادبیات کے موجودہ شمارے میں ہم نے پوری کوشش کی ہے کہ امریتا پریتم کی شخصیت اور فن کے مختلف گوشوں پر جامع بات کی جائے۔"(۳۲)

ادبیات کے شخصیات نمبر کے سلسلے کا ایک اہم نمبر احمد ندیم 'قاسمی نمبر' بھی ہے۔ یہ جون تا جنوری ۲۰۱۶ء کے عرصے پر محیط ہے اور شمارہ ۱۰۸ ہے۔ اس کے ۶۰۴ صفحات ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کے فن اور شخصیت پر جامع مقالات معتبر محققین سے لکھوائے گئے ہیں۔ ایک گوشتہ 'احمد ندیم قاسمی بطور افسانہ نگار'، دوسرا 'احمد ندیم قاسمی بطور شاعر' ہے۔ احمد ندیم قاسمی ترقی پسند تحریک کا بھی حصہ رہے اس لئے اس موضوع پر بھی چار مقالات شامل اشاعت ہیں۔ احمد ندیم قاسمی بطور مدیر دو مقالات شامل ہیں

سہ ماہی ادبیات کا انتظار حسین نمبر جون ۲۰۱۷ء میں منصہ شہود پر آیا۔ اختر رضا سلیمی کی ادارت اور ڈاکٹر قاسم بگھیو کی نگرانی میں شائع ہوا۔ سات سو بیس صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں انتظار حسین کی ادبی خدمات کے حوالے سے گوشے بنائے گئے ہیں۔ 'انتظار حسین شخصیت و فن'، 'بطور سوانح نگار'، 'بطور ناول نگار'، 'بطور افسانہ نگار' اور بطور 'نقاد' ان کی ادبی خدمات پر نگاہ ڈالی گئی ہے۔ اس حوالے سے قاسم بگھیو رقم کرتے ہیں:

> "زیر نظر شمارے میں انتظار حسین کی شخصیت اور فن کی مختلف جہات کے حوالے سے مختلف ابواب قائم کئے گئے ہیں۔ جن کے تحت ممتاز ادیبوں، نقادوں اور محققوں سے خصوصی طور پر حاصل کردہ مضامین اور مقالات شامل کئے گئے ہیں۔"(۳۳)

ادبیات کے شخصیات نمبرز میں 'ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ نمبر' ایک عمدہ دستاویز کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ مارچ ۲۰۱۸ء میں سامنے آیا۔ یہ مجموعی طور پر چھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ ان کے فکر و فن پر جامع مقالات

اس نمبر کی زینت بنے ہیں۔

ادبیات کے شخصیات نمبرز کے سلسلے میں 'عبداللہ حسین نمبر' ہے۔ یہ ستمبر ۲۰۱۸ء میں سامنے آیا۔ یہ شمارہ ۱۷۔۱۱۶ پر محیط ہے۔ پہلا گوشتہ 'عبداللہ کی شخصیت اور فن' کے حوالے سے ہے۔ دوسرا گوشہ 'عبداللہ حسین بطور ناول نگار' پھر 'عبداللہ حسین بطور افسانہ نگار اور کچھ ادباء نے ان کے ساتھ یادوں کو بھی آخر میں درج کیا ہے۔ اس طرح یہ ایک کثیر الجہت نمبر ہے۔ اس کے بارے میں جنید اخلاق رقم کرتے ہیں:

> "زیر نظر شمارے میں عبداللہ حسین کی شخصیت اور فن کی مختلف جہات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ان جہات کے حوالے سے ابواب قائم کئے ہیں۔ جن کے تحت ممتاز ادیبوں، نقادوں اور محققوں سے خصوصی طور پر حاصل کردہ مضامین اور مقالات شامل کئے گئے ہیں۔"(۳۴)

اس طرح یہ نمبرز اعلیٰ پائے کی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ متذکرہ بالا ادباء پر تحقیق کرنے والا ان سے آنے والے ادوار میں مدد ضرور لے گا۔

ادبیات کثیر الجہاتی پرچہ ہے۔ اس میں افسانے اور دیگر اصناف کے حوالے سے گوشے بنائے جاتے ہیں۔ اس میں اعلیٰ پائے کی حمدیہ شاعری بھی ملتی ہے۔ اپنے دور کے جید شاعر حفیظ تائب کا کلام اس میں باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا ہے۔ غزل کے لئے بھی الگ گوشتہ ہوتا ہے جس میں ہمیں فراز، منیر نیازی اور عباس تابش جیسے شعراء کا کلام ملتا ہے۔ ادبیات میں ملک کے تمام گوشوں کے ادباء کو موقع دیا جاتا ہے۔ پرانے لکھنے والوں کے ساتھ نئے لکھنے والوں کو بھی موقع ملتا ہے۔ ادبیات کے صفحات پر نئے اور ابھرتے ہوئے شعراء کی ایک کہکشاں ملتی ہے۔

ادبیات میں ایک گوشتہ تحقیق و تنقید کا بھی بنایا جاتا ہے۔ جس میں اہم نقادوں کے مقالات شائع ہوتے ہیں۔ تنقید کے میدان میں رونما ہونے والے نئے رجحانات پر مضامین بھی نظر آتے ہیں۔ پرانے اور جدید شعراء کے کلام کو نئے تنقیدی پیمانوں پر رکھ کر پرکھا جاتا ہے اور شعری مجموعوں کا تجزیاتی مطالعہ بھی کیا جاتا ہے۔

ادبیات میں پاکستانی زبانوں کے حوالے سے ادب بھی چھپتا ہے۔ پنجابی، سندھی، پشتو، سرائیکی، بلوچی

اور پوٹھوہاری زبان کے ادب کے تراجم چھپتے ہیں۔ پاکستانی زبان کے تخلیق کاروں اور تخلیقات پر تبصرے بھی نظر آتے ہیں۔ اس طرح ادبیات دیگر پاکستانی زبانوں کے ادب کی ترقی میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ادبیات ایک اہم پرچہ ہے۔ اس میں اردو کی تقریباً تمام اصناف کا ادب چھپتا ہے۔ اس میں نثر، نظم، تحقیق، تنقید اور تراجم ہر لحاظ سے قابل قدر ہو رہا ہے۔ اس پرچے کو آنے والے ادوار میں مزید ترقی ملے گی اور مزید معیاری ادب سامنے آنے کے امکانات روشن نظر آتے ہیں۔

iv۔ اردو افسانے کے حوالے سے 'ادبیات' کی خدمات:

'ادبیات' ایک کثیر الجہت پرچہ ہے۔ اس میں تمام اصناف کے حوالے سے تخلیقی ادب چھپتا ہے۔ افسانے کے حوالے سے اس کا ایک خاص گوشہ مختص ہے۔ ادبیات کے پہلے شمارے (جولائی تا ستمبر ۱۹۸۷ء)، تاحال شمارہ نمبر ۱۱۸ (اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۸) پر ایک نظر ڈالی جائے تو اس میں کوئی بھی شمارہ ایسا نہیں ہو گا جس میں افسانہ نہ چھپا ہو۔ اس دوران ادبیات میں پانچ سو کے قریب افسانے چھپ چکے ہیں۔ پہلے شمارے میں اردو کے معروف افسانہ نگاروں کے افسانے چھپے ہیں۔ حجاب امتیاز علی کا 'زنجیر'، ممتاز مفتی کا 'بوتل کا کاگ'، خالدہ حسین کا 'لفظ'، مظہر الاسلام کا 'قتل کا مقدمہ' اور انور زاہدی کا 'نئے شہر کے معنی' اس شمارے کی زینت بنے ہیں۔ دوسرے شمارے پر نظر ڈالی جائے تو اس میں مرزا ادیب کا 'جہیز'، بانو قدسیہ کا 'دربد'، حامد بیگ کا 'ساندنی سوار' منشاء یاد کا 'بے سایہ'، علی تنہا کا 'واردات' اور شمع خالد کا 'اللہ دیاں اللہ جانے' شامل اشاعت ہیں۔ ان دو اولین شماروں ہی سے اندازہ ہوتا ہے کہ ادبیات نے کس احسن انداز میں ان ادباء کی پرورش کی ہے۔ آج جب ہم ادبیات کے آخری شمارے میں ادباء کے افسانوں کی فہرست دیکھیں تو اس میں ۲۱، افسانے شامل اشاعت ہیں۔ یہاں پرانے لکھنے والوں میں خالد فتح محمد، آغا گل، محمد الیاس اور شعیب خالق کے نام نظر آتے ہیں۔ باقی سب نام نئے ہیں۔

اب یہ اندازہ لگانا آسان ہو گیا ہے کہ ادبیات کے صفحات پر ہم افسانہ نگاروں کی تین پیڑیوں سے آشنائی حاصل کر سکتے ہیں۔ ادبیات نے پرانے لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ نئے لکھنے والوں کو بھی متعارف کروایا ہے۔ آج اردو افسانے کا جو منظر نامہ نظر آتا ہے، اس کو مرتب کرنے میں ادبیات کا نمایاں کردار ہے۔

اس عہد کے بڑے لکھنے والوں میں حمید شاہد، حسن منظر اور رشید امجد وغیرہ افسانہ نگاروں کی تراش خراش 'ادبیات' ہی نے کی ہے۔ اب نئی نسل کو متعارف کروانے کے لئے جو کام کیا جارہا ہے قویٰ امکانات ہیں کہ اردو افسانے کا مستقبل روشن ہے۔

ادبیات میں کسی مخصوص علاقے سے ہی ادباء کو نمائندگی نہیں دی جاتی بلکہ اس میں تمام علاقوں سے ادباء شامل ہوتے ہیں۔ ان کی تخلیقات کو شائع کیا ہے۔ اس طرح اردو افسانے کی خدمت کی ہے۔ ادبیات میں اہم افسانہ نگاروں کی وفات کے بعد ان پر خصوصی نمبرز بھی شائع ہوتے ہیں جو افسانے کی خدمت ہی ہے۔ جس میں 'انتظار حسین نمبر'، 'احمد ندیم قاسمی نمبر'، عبداللہ حسین نمبر' اور مختلف اوقات میں ادباء پر شماروں میں گوشے بنائے جاتے ہیں۔ اس طرح ان کے فن اور شخصیت پر معتبر ادباء اور محققین نے مقالات لکھوا کر اردو دنیا کی خدمت کی جاتی ہے۔

اگر اکیسویں صدی کے افسانے کے رجحانات کا اندازہ لگانا چاہیں تو ہمیں ادبیات پر نظر ڈالنی ہو گی۔ کیونکہ ادبیات بلا تعطل چھپتا رہا ہے اور مزید برآں اس کا کوئی شمارہ افسانے کے بغیر نظر نہیں آئے گا۔ بلکہ باقی اصناف کے مقابلے میں افسانہ قدرے زیادہ چھپا ہے۔ اس طرح کہہ سکتا ہے کہ ادبیات کی افسانے کے حوالے سے خدمات ناقابل فراموش ہیں

د۔ معاصر افسانے کے فکری رجحانات: اجمالی جائزہ

معاصر اردو افسانے کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آج کے ادیب کے ہاں عصری شعور بہت زیادہ ہے۔ اردو افسانہ جس نے اپنا آغاز حقیقت پسندی اور رومانیت سے کیا۔ تقریباً ۱۱۶ سال کے اس عرصے میں کئی تحریکات اور رجحانات کو اپنے اندر سموتا ہوا ہمارے عہد میں پہنچا ہے۔ فنی سطح پر بھی کئی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ خالص بیانیہ انداز کی بجائے علامتی اور تجریدی انداز نے ہیت بھی بدل ڈالی۔ بہر حال زیر نظر تحقیق میں فکری مطالعہ پیش نظر ہو گا اس لیے معاصر افسانے کے نمایاں فکری رجحانات پر بحث کرنے سے قبل ان کا اجمالی سا تبصرہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

نئی صدی کے آغاز کے ساتھ ہی ایک بڑا سانحہ 'نائن الیون' کی صورت میں رونما ہوا۔ اس نے مختلف طبقہ ہائے فکر کو اپنے اپنے انداز سے متاثر کیا۔ یہ ایک ہمہ گیر واقعہ تھا۔ جب ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو ورلڈ ٹریڈ سینٹر

کے ساتھ دو جہاز ٹکرائے گئے یہ صرف ٹاور کے گرنے پر مشتمل نہ تھا اس سانحے نے اپنے مابعد آنے والے وقت پر بہت گہرے نقوش مرتب کیے۔ اس کے بعد امریکہ نے دہشت گردی کو بہانہ بنا کر عراق اور افغانستان پر حملے کیے۔ پاکستان بھی اس جنگ میں کود پڑا۔ اس کے بعد ملک طویل خانہ جنگی کا شکار ہوا۔ آئے روز دھماکے معمول بن گے۔ ان حالات نے ظاہر ہے ادیب پر بھی اثرات ڈالے اور امن و امان کی خراب صورتحال کی عکاسی معاصر افسانے میں واضح طور پر نظر آتی ہے۔ لوگوں کے دلوں میں ایک خوف اور بے چینی نے جنم لیا ہے۔ اس کا احساس بھی معاصر افسانہ نگاروں کے ہاں موجود ہے۔ اب تازہ ترین افسانے کا رنگ ہی دیکھیں: "دھماکے نے اس کے ماں باپ کو ایسے بکھیر دیا تھا جیسے تسبیح ٹوٹ کر دانہ دانہ ہو جاتی ہے۔"(۳۵)

بدامنی کی یہ صورتحال معاصر افسانے کا اہم موضوع ہے۔ اس کے بعد معمولات زندگی میں بھی نمایاں تبدیلی آئی ہے۔ اب تقریبات کا انداز بدل گیا۔ امن و امان کی خرابی نے طرز زندگی پر ان مٹ نقوش ثبت کیے جس کی وجہ سے تخلیق کار بھی متاثر ہوا۔ متذکرہ بالا تمام عناصر افسانے میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس طرح یہ معاصر افسانے کا ایک اہم رجحان ہے جس کا تجزیہ پہلے باب میں 'معاصر اردو افسانہ اور نائن الیون' کے عنوان سے کیا گیا ہے۔

ہماری دنیا اب پوری طرح تبدیل ہوتی جارہی ہے۔ ہر آنے والا دن نئی ٹیکنالوجی لے کر آتا ہے جو ہمارے رہن سہن پر بہت زیادہ اثر مرتب کر رہا ہے۔ ذرائع مواصلات کی ترقی نے پوری دنیا کو ایک عالمی گاؤں میں تبدیل کر دیا ہے۔ اب شہروں اور دیہاتوں کے درمیان فرق مٹ رہا ہے۔ دیہاتی ہی کیا بلکہ تمام تہذیبوں کو عالمگیریت سے خطرہ ہے۔ عالمگیریت کے پیچھے صرف امریکیت اور مغربیت کو پوری طرح دنیا میں نافذ کرنے کی کوششیں تیز تر ہو رہی ہیں۔ مقامی تہذیبیں مٹ رہی ہیں۔ مغربی تہذیب غالب آتی جارہی ہے۔ اقدار بدلتی جارہی ہیں۔ اخوت، مساوات، ہمدردی، بھائی چارہ، سادگی اور ہمدردی جیسی خوبصورت اقدار کو بھی عالمگیریت سے خطرہ لاحق ہے۔ عالمگیریت دراصل مغربی ممالک کی اپنی تہذیب کو پھیلانے کی ایک سازش ہے۔ سائنسی ایجادات سے انہوں نے پوری دنیا کی تہذیبوں پر اثرات مرتب کئے ہیں۔ نوجوانوں پر اس ٹیکنالوجی نے بہت زیادہ اثر ڈالا ہے۔ ان کے رہن سہن کو بالکل بدل دیا ہے۔ جب معاصر افسانے پر نظر ڈالی جائے تو یہ رنگ افسانوں میں نظر آتا ہے۔ ان تبدیلیوں کا احساس افسانہ نگار کو ہے ملاحظہ ہو:

"میں نے ٹائپنگ جاری رکھی، اپنی انگلیوں کو روک لینا آسان کام نہیں تھا۔۔۔ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ دستک مسلسل ہونے لگی۔۔۔ ہوتی ہی رہ۔ پوسٹ ابھی پوری نہیں ہوئی تھی۔۔۔ انگلیاں چل رہی تھیں، پورے کی بورڈ کے بٹنوں پر برس رہی تھیں۔ دستک کی آواز بہت اونچی اور مسلسل ہوگئی۔۔۔ مجھ پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔۔ میں ہاتھ نہیں روک سکتا تھا۔"(۳۶)

مندرجہ بالا اقتباس سے ہمارے معاشروں میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ عالمگیریت نے پوری دنیا کے منظرنامے کو بدل کر رکھ دیا۔ مقالہ ہذا کے تیسرے باب میں اس کے اثرات اردو افسانے پر دیکھنے کی سعی کی گی ہے۔ 'عالمگیریت اور معاصر اردو افسانہ' کے عنوان سے اس کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔

معاصر اردو افسانے کے مطالعے کے بعد ایک اور رجحان ہمارے سامنے ابھر کر آتا ہے کہ تانیثی فکر بھی ان افسانوں میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ عورت نے مساویانہ حقوق کے لئے جو جدوجہد کی ہے۔ اس کے باعث اب حالات یکسر بدل چکے ہیں۔ لیکن پھر بھی آج کے افسانے میں ہمیں عورت کے استحصال کی تصویریں کتنی جگہ نظر آتی ہیں۔ عورت کے ساتھ روا رکھا جانے والا ناروا سلوک، اس پر ظلم و زیادتی کرنا صنفی استحصال کی شکلیں معاصر افسانے میں نظر آتی ہیں۔ اب صنفی استحصال کی تصویر پیش کرتے ہوئے بعض اوقات افسانہ نگار تلخ زبان بھی استعمال کرتے ہیں:

"رشتوں کی منڈی میں ابھی تک اس کا مول نہیں لگ پایا تھا۔ روایات اور دستور کے مطابق اس کے ٹھیکے دار بھی اس کے والدین تھے۔ مناسب وقت پر دیر کر دی۔ اب جو بھی ٹینڈر بھرتے بولی کوئی اور لے جاتا۔"(۳۷)

اب صنفی استحصال کی متذکرہ بالا صورت بھی آج کے افسانے میں پوری طرح رچی بسی ہوئی نظر آتی ہے۔ صنفی امتیاز بھی معاصر افسانے میں دکھائی دیتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ عورت کے مقابلے میں مرد کو ترجیح دی جاتی ہے۔ مثلاً لڑکی کی پیدائش کو نیک شگون تصور نہیں کیا جاتا، جبکہ بچے کی پیدائش پر گھی کے چراغ

جلائے جاتے ہیں۔ یہ ہمارے دوہرے معیارات ہیں۔ مرد اور عورت کے لئے بحیثیت مرد اور عورت الگ الگ معیارات بنا چکے ہیں۔ گناہ میں دونوں شریک ہوں تو لعن طعن صرف عورت کو کیا جاتا ہے۔ اس طرح کے دوہرے معیارات کا احساس اور شعور بھی آج کے افسانہ نگار کے ہاں موجود ہے۔ اس طرح آج کے افسانوں میں تانیثی افکار نظر آتے ہیں۔ مقالہ ہذا کے باب چہارم میں تانیثیت اور معاصر اردو افسانہ کے عنوان سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

متذکرہ بالا تینوں رجحان زیادہ نمایاں ہیں۔ اس لیے زیر نظر تحقیق میں ان تینوں فکری رجحانات کا معاصر اردو افسانے میں مطالعہ کیا گیا ہے۔ ادبیات میں چھپنے والے افسانوں کو سامنے رکھتے ہوئے متذکرہ بالا تینوں موضوعات پر شواہد کی روشنی میں بحث کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، عزیز بک ڈپو، لاہور، بار پنجم، ۲۰۰۶ء، ص ۳۷۱

۲۔ انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ، ایک صدی کا قصہ، مثال پبلشرز فیصل آباد، نقش ثانی ۲۰۱۰ء، ص ۳۵

۳۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، اردو افسانہ (بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں) پورب اکادمی، اسلام آباد، فروری ۲۰۰۸ء، ص ۴۸

۴۔ انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ، ص ۲۳۶

۵۔ سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر، جدید اردو افسانے کے رجحانات، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۱۶ء، ص ۱۸۱

۶۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، ص ۷۷۴

۷۔ محمد حمید شاہد، اردو افسانہ 'صورت معنی' سٹی پک پوائنٹ، کراچی، ۲۰۱۸ء، ص ۹۵

۸۔ انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ: ایک صدی کا قصہ، ص ۳۳۰

۹۔ آصف فرخی، ڈاکٹر، انتظار حسین: شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد ۲۰۰۶ء، ص ۷۱۔۷۰

۱۰۔ مرزا حامد بیگ، اردو افسانے کی روایت (۱۹۰۳ء۔۲۰۰۹ء)، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۱۲۱

۱۱۔ بی بی آمنہ، خالدہ حسین، شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء، ص ۶۳

۱۲ انوار احمد، اردو افسانہ، ایک صدی کا قصہ، ص ۱۶۵

۱۳۔ اسلم سراج، محمد منشاء یاد، شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۹۲

۱۴۔ محمد حمید شاہد، اردو افسانہ، صورت و معنی، ص ۳۰۔۱۲۹

۱۵۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، رشید امجد، شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد ۲۰۱۰ء، ص ۵۲

۱۶۔ محولہ بالا، ص ۶۶

۱۷۔ محمد حمید شاہد، اردو افسانہ: صورت و معنی، ص ۱۳۴،

۱۸۔ انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ، ص ۵۳

۱۹۔ فضیل جعفری، ابتدائیہ، مشمولہ، جانکی بائی کی عرضی، مصنف، مرزا حامد بیگ، دوست پبلی کیشنز، اسلام

آباد، ۲۰۱۱ء، ص ۷
۲۰۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، چُپ کی داد (دیباچہ)، مشمولہ: چُپ، مصنفہ: بشریٰ رحمن، آہو الیہ بک ڈپو، نئی دہلی، ۲۰۰۶ء، ص ۸
۲۱۔ خاور نقوی، پوٹھوہار میں اردو افسانہ نگاری، (تحقیقی و تنقیدی جائزہ)، کاشف بک ڈپو، اسلام آباد، ۱۹۹۷ء، ص ۱۷۳
۲۲۔ انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ، ص ۵۳۶
۲۳۔ مقصودہ حسین، ڈاکٹر، مسعود مفتی، شخصیت و فن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۱۰۴
۲۴۔ فیصل احمد گوندل، آغا گل کے افسانے اور بلوچستان (مضمون)، www.nlpd.gov.pk article ۱۲ مارچ ۲۰۱۹ء، 10:40pm
۲۵۔ اسد محمد خان، پیش لفظ، مشمولہ: گنجی بار، مصنفہ: طاہر اقبال، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد ۲۰۰۸ء، ص ۷
۲۶۔ pal.gov.pk/about/ ۱۲ مارچ ۲۰۱۹ء 4:00pm
۲۷۔ اکادمی ادبیات پاکستان، (تعارف نامہ)، ص ۳
۲۸۔ سعدیہ افتخار، اکادمی ادبیات پاکستان کی خدمات: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ (اردو زبان و ادب کے حوالے سے)، مقالہ برائے ایم فل (اردو) نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ص ۱۴
۲۹۔ www.pal.gov.pk/allbiyaat ، ۱۲ مارچ ۲۰۱۹ء 6:30pm
۳۰۔ تیمور اختر، ادبیات کے شخصیات نمبرز کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، مقالہ برائے ایم فل اردو، وفاقی اردو یونیورسٹی، اسلام آباد، اگست ۲۰۱۷ء، ص ۲
۳۱۔ ادارہ، حرف اول، مشمولہ: سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱، جولائی تا ستمبر ۱۹۸۷ء، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد
۳۲۔ فخر زمان (حرفے چند)، مشمولہ: سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۸۶۔۸۵، اکتوبر ۲۰۰۶ء تا مارچ ۲۰۱۰ء، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ص ۳
۳۳۔ قاسم بگھیو، ڈاکٹر، اداریہ، مشمولہ: سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۱۲۔۱۱۱، جنوری تا جون ۲۰۱۷ء، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد
۳۴۔ سید جنید اخلاق، اداریہ، مطبوعہ: سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۱۷۔۱۱۶، اپریل تا ستمبر ۲۰۱۸ء

۳۵۔ سید ماجد شاہ، گھر آباد ہیں (افسانہ) مطبوعہ: سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۱۸، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۸ء، ص ۱۶۸

۳۶۔ ابن آس محمد، نئے انسان کی لوسٹوری (افسانہ)، مطبوعہ: شمارہ ۱۱۸، ص ۱۵۰

۳۷۔ ارشد مرشد، اردو ادب ڈاٹ کام (افسانہ) مطبوعہ: شمارہ ۱۱۸،، ص ۱۲۵

باب دوم:

معاصر اردو افسانہ اور نائن الیون

الف ۔نائن الیون: پس منظر، تعارف اور ادب پر اثرات:۔

i۔پس منظر:

امریکہ جب سے ترقی یافتہ ممالک کی صف میں کھڑا ہوا ہے اس نے غریب اور کمزور ممالک کو اپنے مفادات کی خاطر استعمال کیا ہے۔ امریکہ نے مسلم ممالک کے ساتھ معاندانہ رویہ اختیار کیے رکھا ہے۔ اس لئے مسلم ممالک میں بھی بالعموم امریکہ کو پسند نہیں کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے امریکہ نے ہمیشہ شک کی وجہ سے مسلمان ممالک کو کسی نہ کسی طرح نقصان پہنچانے کی کوشش پچھلے کئی سالوں سے جاری رکھی ہوئی ہے۔ ظاہر ہے ظلم جب حد سے بڑھ جائے تو اس کا رد عمل بھی لازمی طور پر کسی نہ کسی شکل میں سامنے آتا ہے۔ امریکہ صرف مسلم ممالک ہی کے لئے نہیں بلکہ کئی دوسرے یورپی ممالک کے لئے دردِ سر بنا رہا ہے۔ سپر پاور ہونے کی وجہ سے اقوام متحدہ کو بھی امریکہ نے استعمال کرتے ہوئے ہمیشہ اپنے مفادات کو حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ساری دنیا کی ذمہ داری جیسے امریکہ ہی نے لے رکھی ہے۔ کسی نہ کسی انداز سے امریکہ تمام ممالک کی داخلی آزادی سلب کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ اس طرح دوسرے ممالک کے لوگوں کے اندر بھی انتقام کی آگ بھڑکتی ہے جس کے نتائج نائن الیون کی صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ پھر ایسے واقعات اپنے پیچھے صرف تباہی کے مناظر ہی چھوڑتے ہیں۔ اس کے پیچھے صرف آہیں اور سسکیاں باقی رہتی ہیں اور انسانی خون پانی سے بھی ارزاں ہو جاتا ہے۔ انتقام کے ایسے کئی واقعات عالمی منظر نامے پر ابھرتے ہیں جن کا مقصد دوسروں کو نقصان پہنچا کر بدلے کی آگ کو ٹھنڈا کرنا ہوتا ہے۔ نائن الیون بھی مجھے ایسے ہی واقعات کا ایک شاخسانہ نظر آتا ہے جس کی اصل وجہ امریکہ کی حد سے بڑھی ہوئی معاندانہ کارروائیاں تھیں۔ ان کارروائیوں کے رد عمل میں امریکہ کی سرزمین پر ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے انسانی تاریخ کو واضح طور پر دو منطقوں میں تقسیم کر کے رکھ دیا ہے۔ ذیل میں ہم نائن الیون کے تعارف، اس کے اثرات و نتائج کو نکات

کی شکل میں بیان کرتے ہوئے اس موضوع کا احاطہ کرنے کی سعی کریں گے۔

ii۔ تعارف:

نائن الیون دراصل ستمبر کی گیارہ تاریخ کی نسبت سے مشہور ہوا ہے۔ گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء کو امریکی فضائی کمپنی کے چاروں جہازوں کے اغواء کی خبر امریکی خبر رساں ایجنسیوں کے ذریعے سے ملک کے طول و عرض میں پھیل گئی۔ اس وقت ان کی تمام تر سائنسی ترقی اور دفاعی حصار کی قلعی کھل گئی جب محض کچھ لوگوں نے چار جہازوں کو اغواء کر کے امریکہ کے اہم مقامات پر حملہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ بی بی سی نے ۱۱ ستمبر ۲۰۱۱ء کو اس کے دس سال پورے ہونے پر ان الفاظ میں نائن الیون کو یاد کیا ہے:

> "گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء: القاعدہ کے خودکش ہائی جیکرز نے امریکہ میں چار مسافر بردار ہوائی جہازوں کو اغواء کر لیا۔ ان میں سے دو جہاز نیویارک میں واقع ورلڈ ٹریڈ سینٹرز کی دو بلند عمارتوں سے ٹکرا دیئے جس سے دونوں عمارتیں زمین بوس ہو گئیں۔ ایک جہاز واشنگٹن میں پینٹاگون کی عمارت سے ٹکرایا گیا جبکہ ایک جہاز پنسلوانیا میں گر گیا۔"(۱)

اس طرح دہشت گردی کے ان واقعات نے پوری دنیا کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ انسانیت کے ناطے دنیا میں ظلم کسی بھی جگہ کسی بھی صورت میں ناقابل قبول ہے اب یہ قہر ڈھانا بھی انتقام تھا جس کا خمیازہ امریکہ کے ساتھ ساتھ بعد میں دوسرے ممالک کو بھی اٹھانا پڑا۔

پہلے دو جہاز صبح آٹھ بج کر چھیالیس منٹس پر نیویارک میں موجود ورلڈ ٹریڈ سینٹرز کی عمارت سے ٹکرائے گئے۔ اس سانحے میں تین ہزار لوگ مارے گئے جبکہ چھ ہزار کے قریب لوگ زخمی ہوئے۔ ایک جہاز پینٹاگون کی عمارت کے قریب گرایا گیا۔ جہاز جس نے وائٹ ہاؤس کے ساتھ ٹکرانا تھا اس کا حملہ ناکام بنا دیا گیا۔ اس طرح ان واقعات نے اپنے بعد والے دور کو بے حد متاثر کیا۔ نائن الیون کے بعد امریکہ نے بہانہ بنا کر عراق اور افغانستان پر چڑھائی کر دی۔

اگرچہ یہ واقعات پاکستان سے بہت دور رونما ہوئے لیکن پاکستان کے جغرافیائی، سیاسی اور عسکری اہمیت کے پیش نظر ان واقعات نے ہمارے ملکی حالات کو بہت بری طرح متاثر کیا۔ ان واقعات میں پاکستان کا کوئی باشندہ بھی شامل نہیں تھا لیکن افغانستان کی دہشت گرد تنظیم القاعدہ کے سربراہ اسامہ بن لادن نے ان

حملوں کی ذمہ داری قبول کی جس کی وجہ سے امریکہ نے افغانستان پر حملہ کر کے یہاں شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دی۔ افغانستان پر حملوں کے لئے اڈے پاکستان کے حکمران جنرل پرویز مشرف نے فراہم کیے جس کے بعد ہم غیر کے گھر میں لگی ہوئی آگ کو اپنے گھر لے آئے۔ بعد میں والے ادوار میں یہ آگ خود ہمیں جلا رہی ہے۔ اس آگ نے ہمارے ملک کو ہر سطح پر متاثر کیا ہے۔ پروفیسر اعجاز خان نے نائن الیون کی توضیح ان الفاظ میں کی ہے:

> "The 9/11 refers to a series of three well planned and executed attacks by an carefully chosen targets representing power of Unite State of America on September, 11, 2001." (۲)

مندرجہ بالا اقتباس میں درج ہوا کہ 'Well Planned' دراصل بعد میں یہ بھی قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ دھماکے خود امریکہ نے کروائے تھے تاکہ اس کو عراق اور افغانستان پر حملہ کرنے کا موقع مل جائے۔ اس لئے اس کو امریکی سازش بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اتنی سخت سکیورٹی کے ہوتے ہوئے یہ کس طرح ممکن ہوا کہ چار طیارے اغواء کر لئے گئے۔ دراصل یہ ایک سوچی سمجھی چال ہی دکھائی دیتی ہے۔ اس واقعے کو بنیاد بنا کر بعد میں امریکہ نے جو کچھ کیا یہ دراصل سب کو شک میں مبتلا کر دیتا ہے۔

iii۔ نائن الیون کے اثرات:

نائن الیون ایک ایسا سانحہ تھا جس نے پوری دنیا کو کسی نہ کسی صورت میں متاثر کیا۔ اس کے بعد دہشت گردی کی وہ آگ بھڑکی جس پر قابو پانا ابھی تک ناممکن نظر آتا ہے۔ امریکہ کی شہ رگ پر جب یہ حملے ہوئے تو امریکہ کا ردعمل بھی آناً عین تقاضہ فطرت تھا۔ اس نے فوراً انتقام لینے کا فیصلہ کیا۔ سات اکتوبر ۲۰۰۱ء کو امریکہ نے افغانستان پر چڑھائی کر دی اور ۲۰۰۳ء میں عراق کی سرزمین پر بھی حملہ کر دیا۔ اس طرح مولی کے چور کو سزا سولی ہوئی جہاں تین ہزار لوگ مرے تھے اس کے بدلے میں لاکھوں افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور بے شمار لوگوں کو چھت سے محروم کر دیا گیا۔ ان دو ممالک میں جو آگ امریکہ نے لگائی تھی اس کے شعلوں کی لپیٹ میں اب خود امریکہ بھی آچکا ہے۔ پاکستان دو وجوہات کی بناء پر اس جنگ میں کود پڑا۔ ایک

سابق صدر پرویز مشرف نے امریکہ کو حملہ کرنے کے لئے اڈے فراہم کئے۔ دوم پاکستان کی جغرافیائی حیثیت کے باعث پاکستان کی سرحد افغانستان کے ساتھ لگتی ہے بعد میں اسی سرحد کے پار سے امریکی ڈرون حملے بھی روز کا معمول بن گے۔ ان ڈرون حملوں کے نتیجے میں بے شمار لوگ مارے گے۔

پرائی آگ کو ہم اپنے گھر لے آئے جس کی وجہ سے آج تک حالات ہمارے قابو سے باہر ہیں اور ہمیں بے حد نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے۔ اس بحث سے ثابت ہوا کہ نائن الیون ایک ہمہ گیر واقعہ تھا جس نے پوری دنیا پر اثرات مرتب کئے۔ اس کے نتیجے میں جو حالات رونما ہوئے وہ ادب کا موضوع بھی بنے۔ انگریزی ادب میں بھی اس پر جم کر لکھا گیا اردو میں بھی قلمکاروں نے اس کو مختلف انداز سے برتا ہے۔ اس کو دیکھنے سے قبل انگریزی روایت کو تھوڑا سا دیکھ لیتے ہیں۔

iv۔ نائن الیون کے انگریزی ادب پر اثرات: مختصر جائزہ

ادب کو جب یہ کہا گیا کہ ادب تنقید حیات ہے تو بات واضح ہو جاتی ہے کہ ادب اپنے عصر سے قدم سے قدم ملا کر چلتا ہے۔ ادیب معاشرے کا سب سے حساس فرد ہوتا ہے۔ وہ بعض اوقات جگ بیتی کو آپ بیتی اور بعض دفعہ آپ بیتی کو جگ بیتی کے انداز میں پیش کرتا ہے۔ ادیب معاشرے کا حساس فرد ہونے کے ناطے کسی بھی واقعہ کے تمام پہلوؤں پر غور و فکر کرنے کے بعد اس پر قلم اٹھاتا ہے تاکہ لوگوں کے سامنے اصل تصویر کو رکھا جا سکے۔ اس سانحہ جانکاہ سے انگریزی کا قاری اور لکھاری دونوں متاثر ہوئے۔ انگریزی میں اس سانحے کے پس منظر پر کئی ناول لکھے گئے جن میں محسن احمد کا ناول 'The Reluctant Fundamentalist' ایک اعلیٰ پائے کا ناول ہے۔ اس کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ لاہور کے ایک کیفے میں ایک پاکستانی ایک امریکن شہری کو اپنا قصہ سنا رہا ہے۔ وہ اسے بتا رہا ہے کہ امریکہ میں وہ بہت کامیاب گریجویٹ تھا۔ وہاں پر وہ اچھی نوکری بھی کرتا تھا اور ایک لڑکی سے دوستی بھی تھی لیکن گیارہ ستمبر کے واقعہ نے اس سے سب کچھ چھین لیا۔

یہ ناول دراصل ان پاکستانیوں کے حالات کو بیان کرتا ہے جو کہ کئی سالوں سے امریکہ میں مقیم تھے۔ انہوں نے اپنا وطن امریکہ کو بنالیا تھا۔ وہاں پر ان کے کاروبار پوری طرح جم چکے تھے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی یہ نہ تھا کہ انہیں اس ملک کے باشندے غیر سمجھ کر معاندانہ سلوک شروع کر دیں گے۔ گیارہ ستمبر کے بعد

ایسا ہی ماحول بنا کر مسلمانوں کو شک کی نظر سے دیکھا جاتا اور ان کو دھتکارا جاتا۔ نتیجتاً کئی لوگوں کو واپس اپنے ملک کا رخ کرنا پڑا۔

اگلا ناول کلیر میسود کا سامنے آتا ہے۔ جس کا نام 'The Emperor's Children' ہے۔ یہ ایک مقبول عام ناول ہے اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ نائن الیون کے پس منظر میں لکھے ناولوں میں ایک بہترین ناول ہے۔

اس کے بعد کن کلفوس کا ناول 'A Disorder Peculiar to the Country' بھی نائن الیون کے تناظر میں لکھا گیا ناول ہے۔ جیس والٹر کا ناول 'The Zero' بھی اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ ورلڈ ٹریڈ سینٹرز کی عمارت سے ایک آدمی گرا تھا اس عنوان سے ڈان ڈیلیلو کا ناول 'Falling Man' بھی خاصے کی چیز ہے۔

ناول کے علاوہ یہ کام افسانے میں بھی ہوا ہے۔ روب میگنوسن کی مختصر کہانیوں پر مشتمل کتاب 'Second Skull' کا تعلق بھی ناقدین نے ۹/۱۱ کے ساتھ جوڑا ہے۔ 'Echo' افسانوں کی ایک اور کتاب ہے جو کہ لیلیٰ لہلامی نے لکھی ہے۔ 'Temple of Tears' نامی کتاب جیوف ڈاہر نے لکھی ہے۔ کومیلہ شمسی کی کتاب 'Our Deed Your Deed' بھی نائن الیون کے پس منظر میں لکھی گئی کہانیوں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ نائن الیون پر کئی ڈاکومینٹریز اور فلمیں بھی بن چکی ہیں۔ فنکاروں نے اس موضوع پر خوب جم کر لکھا ہے۔ جب انگریزی ادب میں اس قدر کام ہوا ہے تو اردو ادب کا لکھاری بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔

v۔ اکیسویں صدی کی پہلی دہائی کا اردو افسانہ اور نائن الیون:

جیسا کہ پہلے مذکور ہوا کہ پاکستان ایسے واقعہ سے براہ راست متاثر نہیں ہوتا تھا لیکن امریکہ نے بدلے کی آگ میں افغانستان پر جو حملہ کیا اس کے نتیجے میں پاکستان بے حد متاثر ہوا۔ اس حملے کے متعلق ڈاکٹر الطاف یوسفزئی رقم طراز ہیں:

"آخر کار بدلے کا دن آن پہنچا اور سترہ اکتوبر ۲۰۰۱ء کو رات ۳۰۰ ایف سولہ اور ایف

پندرہ طیاروں اور ۳۵۰۰ فوجیوں سے افغانستان کی سرزمین پر حملہ آور ہو کر جدید ترین B:52 جہازوں سے شہریوں پر بم برسائے گئے الامان۔ امریکی غصہ تھا کہ ٹھنڈا ہونے میں نہیں آرہا تھا۔"(۴)

اس طرح بدلے کی آگ میں امریکہ تڑپ رہا تھا اس نے اپنے جدید ترین ہتھیاروں اور اعلیٰ پیشہ وارانہ صلاحیتوں کے مالک فوجیوں کے ساتھ افغانستان پر چڑھائی کر دی جس کی وجہ سے پاکستان پر بھی یہ اثر پڑا ایک تو افغانستان برادر اسلام ملک ہے دوسرا پاکستان کی مغربی سرحد بھی افغانستان کے ساتھ لگتی ہے۔ اب ہماری یہ سرحد محفوظ نہ رہی۔ اسی سرحد کے راستے سے ڈرون حملے ہوتے رہے۔ قیمتی جانوں کا ضیاع معمول بن گیا۔ روزمرہ زندگی بری طرح متاثر ہوئی۔ افراد کے اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے کے آداب پوری طرح بدل گئے۔ ان حالات نے پاکستانی فرد کو بری طرح جکڑ کر رکھ دیا اس کے متعلق پروفیسر اعجاز نے ان الفاظ میں تصویر کی ہے:

Question of security now permeate our lives. All planning be that a holiday trip, a wedding reception, selection of school for children, location for house, job, friendhsip with someone, even a selection of restaurant for just evening meal, people will take security factor in account. (۵)

اس طرح یہ بات ثابت ہوئی کہ نائن الیون کے بعد ہمارے ملک میں ایک نئی طرح کی صورتحال نے جنم لیا ہے۔ حفاظتی اقدامات کو زندگی میں بہت اہمیت حاصل ہو چکی ہے۔ پہلے زمانے میں انسان کسی بھی مجمعے میں آسانی سے جا سکتا تھا لیکن اب کسی بھی گروہی شکل میں خطرہ موجود رہتا ہے کہ کوئی بم نہ پھٹ جائے۔ اب ہم اپنے تمام منصوبے ان حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے تشکیل دیتے ہیں۔ آج کا انسان روز روز کی وحشت ناک خبروں سے بری طرح اکتا چکا ہے۔ اس کے آس پاس انسانی خون اس قدر ارزاں ہے کہ اس کو خود پتا نہیں کہ کب کسی کی زندگی کا چراغ کس چوراہے پر گل کر دیا جائے گا۔ اس لئے آج کا فرد اپنے تمام قسم کے منصوبے

بناتے وقت امن و امان کی صورتحال کو پوری طرح مد نظر رکھتے ہوئے فیصلہ کرتا ہے۔ فرد کے روزمرہ معمولات پر بھی بہت سے قدغنیں لگ چکی ہیں۔ اب فرد کسی بھی لمحے اپنے آپ کو آزاد نہیں سمجھتا ہے بلکہ قدم قدم پر بلاوجہ شک کیا جاتا ہے۔ اس ساری صورتحال میں زندگی گزارنی مشکل ہو گئی ہے۔ امن و امان کی اس خراب صورتحال کے پیچھے ہمارے حکمرانوں کے ناعاقبت اندیش فیصلوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس میں چاہے ضیاء الحق کا دور ہو یا پرویز مشرف کا دور ہو۔ کہا جاتا ہے کہ ضیاء دور میں بھی جہادی تیار کیے اب یہی جہادی ہمارے گلے کی ہڈی بن چکے ہیں۔ تنگ نظری عام ہو چکی ہے۔ اس دور کے متعلق رشید امجد نے وضاحت کی ہے۔

> "یہ زمانہ پاکستانی معاشرے میں فکری انحطاط کا زمانہ ہے۔ سیاسی عمل کو روکنے کے لئے مذہبی تشدد اور گروہ بندی کو منظم طور پر فروغ دیا گیا۔ مذہب کی رسومات کی بجائے ظاہری رسومات پر زور دیا گیا اور یوں پاکستانی معاشرے کو ایک بند معاشرے میں تبدیل کر دیا گیا۔"(۶)

سیاستدانوں نے اپنے مخصوص مقاصد کے لئے مذہبی عقیدت سے فائدہ اٹھانے کی منفی کوشش کی جس کی وجہ سے فرقہ واریت اور عدم برداشت بھی ہمارے معاشرے میں در آئے۔ نائن الیون کے بعد یہ تمام واقعات ادیب کے حساس ذہن کو متاثر کر رہے تھے۔ اگرچہ یہ حالات سیاسی نوعیت کے ہیں لیکن انہوں نے ادب پر بھی اثر ڈالا۔ اس کے متعلق ڈاکٹر رشید امجد کی یہ بات درست معلوم ہوتی ہے۔ "سیاسی شعور، سیاسی حالات و واقعات براہ راست ادب نہ ہوتے ہوئے بھی ادب کا حصہ ہوتے ہیں۔"(۷)

اس طرح پاکستانی سرزمین پر بھی آئے روز دھماکے ہوئے پاکستان نے دہشت گردی کو ختم کرنے کے لئے امریکہ کا حلیف بننا پسند کیا بدلے میں ہمیں اپنے ملک کے امن کو ختم کرنا پڑا۔ نائن الیون کے بعد امن و امان کی اور سکیورٹی کی صورتحال پوری طرح بدل چکی ہے۔ اب انسان کسی بھی جگہ محفوظ نہیں ہے۔ عدم تحفظ کا یہ احساس فرد میں پوری شدت کے ساتھ موجود ہے۔ اس عدم تحفظ کے احساس کو بہت سے افسانہ نگاروں نے اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

جہاں تک اردو ادب میں نائن الیون پر تنقید و تحقیق کے کام کا تعلق ہے۔ اس سلسلے میں دو اہم کتابیں

ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ان میں افسانے پر ڈاکٹر نجیبہ عارف کی کتاب '۱۱/۹ اور پاکستانی اردو افسانہ'، جو پہلی بار مئی ۲۰۱۱ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد ڈاکٹر الطاف یوسفزئی کی کتاب 'اردو نظم اور نائن الیون' بھی ایک اہم اضافہ ہے۔ ان کتب میں ادب کا انتخاب شامل ہے اور دونوں کتابیں ۱۲۔۲۰۱۱ء میں مرتب ہوئی ہیں۔ اس لئے ہمارا کام ۲۰۱۱ء کے بعد کا ہے۔ نائن الیون کے متعلق اردو میں پشاور یونیورسٹی کے مرتب کردہ مقالات جو کہ ایک کانفرنس میں پیش کئے گئے۔ بعنوان "پاکستانی زبان و ادب پر نائن الیون کے اثرات"، ۷ تا ۱۱ اگست باڑہ گلی، سمر کیمپس پشاور یونیورسٹی اور ہائیر ایجوکیشن کمیشن کے تعاون سے بین الاقوامی کانفرنس ہوئی۔ اس میں پڑھے گئے مقالات متذکرہ بالا انتخاب میں شامل ہیں۔ ان مقالات کو ایک اہم اضافہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان تمام مقالات میں جامع مقالہ 'پاکستانی اردو افسانے پر ۱۱/۹ کے اثرات' جو کہ ہمارے موضوع سے متعلقہ ہے۔ نائن الیون اور اردو افسانے پر بات کرتے ہوئے سب ناقدین نے بات مسعود مفتی کے افسانے 'شناخت' سے شروع کی ہے۔

'شناخت' مسعود مفتی کا افسانہ ہے جو کہ ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا۔ یہ افسانہ امریکہ میں مقیم پاکستانی کرداروں کے گرد گھومتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس افسانے میں بنیادی کردار خالد اور سلیم ہیں۔ سلیم خالد کا دوست ہے۔ خالد یہاں سے باہر جاتا ہے۔ امریکہ میں جاکر وہ سیکولر خیالات کا مالک ہو جاتا ہے اور ایک لڑکی جو زمین سے شادی کر لیتا ہے جو کہ عیسائی لڑکی ہے۔ بعد میں اس سے اس کی اولادیں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ وہ وہاں پر خوشی سے زندگی بسر کر رہا ہوتا ہے۔ اچانک گیارہ ستمبر کا واقعہ رونما ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کو ایک عجیب طرح کی کیفیت جکڑ لیتی ہے۔ وہ عجیب و غریب خواب دیکھنے لگتا ہے اس صورتحال میں وہ واپس پاکستان والدین کو ملنے کا فیصلہ کرتا ہے جبکہ وہ واپس آتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ نائن الیون ایک ایسا جھٹکا تھا جس نے امریکہ میں مقیم پاکستانی لوگوں کو ان کی اصل شناخت کے قریب کر دیا۔ پاکستان میں والدین سے ملنے کے بعد وہ جب امریکہ جاتا ہے تو اس کے بچے عیسائیت کے تحت اپنے دادا کی تصویر رکھ کر کچھ مذہبی رسومات ادا کر رہے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد خالد عجیب طرح کی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کے آس پاس ایک بنگلہ دیشی مفیض بھی رہتا ہے۔ ایک دن وہ پاس ہی پارک میں نماز ادا کر رہا ہوتا ہے تو انگریز بچے اس کو دہشت گرد سمجھ کر گھیر لیتے ہیں۔ اتنے میں خالد بھی وہاں پہنچ جاتا ہے اور مفیض کی جان بچا لیتا ہے۔ آخر میں خالد جو سیکولر ہو

چکا ہوتا ہے واپس اپنے مذہب کی طرف لوٹ آتا ہے۔

"مفیض نے اتر کر دھڑاک سے گاڑی کا دروازہ بند کیا اور مسجد کے دروازے کی طرف چل دیا۔ خالد چند لمحے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے جلدی سے گاڑی کا دروازہ کھول کر آواز دی۔ مفیض نے مڑ کر دیکھا۔ تو خالد بلند آواز میں کہنے لگا "ذرا رک جاؤ مفیض میں بھی آرہا ہوں۔"(۸)

اس طرح یہ افسانہ جس کے تمام تر واقعات کا تعلق ۱۱/۹ سے جوڑ کر کہانی تیار کی گئی ہے۔ یہ امریکہ یا بیرونی ممالک میں مقیم پاکستانیوں یا مسلمانوں کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا گیا یہ اس کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ امریکہ نے اسلام دشمنی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دہشت گردی کو مسلمانوں کے ساتھ مخصوص کر دیا جس کی وجہ سے تمام بیرونی ممالک میں مقیم پاکستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کو شک و شبے کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ ان کی حرکات پر نظر رکھنا روز کا معمول بن گیا بلکہ کسی کو بھی دہشت گرد سمجھ کر اس کو زدوکوب کرنا روز کا معمول بن گیا۔ اس عدم تحفظ کی صورتحال میں مسلمانوں کو اپنے آبائی ملکوں کی یاد ستانے لگی۔ دوسرے الفاظ میں نائن الیون ایک ایسا جھٹکا تھا جس نے مسلمانوں کو ان کی جڑوں کے ساتھ دوبارہ سے وابستہ کر دیا۔ پھر غیر ممالک میں مقیم لوگوں کو اپنے وطن کی یاد ستانے لگی اور وہ پلٹ کر اپنے ملک آئے۔ اس طرح نائن الیون کی صورتحال میں جو پہلا اثر دکھائی دیتا ہے اس کی بھرپور عکاسی اس افسانے میں کی گئی ہے۔

افتخار نسیم کا افسانہ 'پردیسی' بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس کا بنیادی کردار اسلم ہے جو چالیس سال سے امریکہ میں مقیم ہے۔ وہ بھی وہاں اپنی شناخت بھول چکا ہے۔ اب ذرا دیکھیے اس کو اپنی شناخت کیسے یاد آتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو۔

"اسلم پر بچپن سے لے کر اب تک کیا کیا نہیں گزری مگر آج اس کو ڈرگ سٹور کی پارکنگ لاٹ میں جاتے ہوئے کار میں سے کسی امریکن کی آواز آئی۔" Get back to your country mother F"۔"(۹)

اس طرح پہلی صورتحال جو نائن الیون کے بعد پیش آئی وہ تھی بیرونی ممالک میں مقیم مسلمانوں کو

عدم تحفظ کا احساس ہو گیا جو لوگ کئی سالوں سے دیار غیر کو اپنا ملک سمجھے ہوئے اور شیشوں کے خیالی محل بنائے ہوئے تھے دھڑام سے گر گئے اور ان کے خواب چکنا چور ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی جڑوں کی طرف رجوع کرنے پر بھی مجبور کیا۔ شناخت کا خالد جو امریکہ میں رہ کر سیکولر ہو گیا تھا آخر میں وہ اپنے مذہب کی طرف مراجعت کر جاتا ہے۔ جبکہ 'پردیسی' کا نسیم بھی ایک ایسا ہی کردار ہے اس کو تو کبھی چھاؤں ملی ہی نہیں اور آخر میں انگریز کے الفاظ "Go back to your country" تو گویا نشتر ثابت ہوئے اور اس کے اندر عدم تحفظ کے احساس کو شدید تر کر دیا۔ نائن الیون نے سب سے زیادہ اور جلدی متاثر امریکہ میں مقیم پاکستانیوں کو کیا۔ متذکرہ بالا افسانے اسی جہت کی نشاندہی کرتے ہیں۔

نیلوفر اقبال جو عصر حاضر کی معروف افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے بھی اس موضوع پر ایک افسانہ 'آپریشن مائیس' کے نام سے لکھا ہے۔ 'آپریشن مائیس' میں امریکہ کے نائن الیون کے بعد کے منصوبوں کی نشاندہی کی گئی ہے کہ کس طرح دو ٹاورز گرنے کے بعد امریکہ نے آئندہ سو سال کی منصوبہ بندی کی ہے۔ اس افسانے کا بنیادی کردار جنرل مرسی ہے۔ اس کی بیوی کا نام مار تھا ہے۔ مرسی کی ایک کتیا بلیئر ہے جو بیمار پڑ جاتی ہے جس کی وجہ سے اس کو زہریلا انجکشن لگا کر موت کی وادی میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد جنرل مرسی کو پینٹاگون میں ایک اہم میٹنگ میں شرکت کے لئے بلا لیا جاتا ہے اور وہ اس میں شریک ہوتا ہے۔ جس میں اس بات کا فیصلہ کیا جاتا ہے کہ تیل کے خزانے سے معمور ملک عراق پر حملہ کیا جائے گا۔ جنرل مرسی امریکی اداروں کی عکاسی ان الفاظ میں کرتا ہے۔ "لیکن خزانہ ہو بہت ہی بڑا بہت ہی بڑا خزانہ، دنیا کا سب سے بڑا خزانہ، تمہارے تصور سے بھی بڑا۔۔۔ اور اس پر چوہوں کا قبضہ ہو تو۔۔۔۔۔؟"(۱۰)

اس طرح اس کہانی میں امریکی اداروں کو بڑے واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح امریکہ عراق میں موجود تیل کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ عربوں کے لئے انہوں نے استعارہ 'چوہے' استعمال کیا جو دنیا کی بہت بڑی دولت پر قابض ہیں۔ اب اس دولت پر امریکہ اپنے ہاتھ صاف کرے گا۔ امریکہ کے انہی معاندانہ عزائم کو اس کہانی میں نیلوفر اقبال نے اپنا موضوع بنایا ہے۔

نیلوفر اقبال نے اسی افسانے کے آگے دوسرا افسانہ بھی لکھا ہے۔ جس کا نام 'سرخ دھبے آپریشن مائیس II' ہے۔ یہ پہلے افسانے کی توسیع معلوم ہوتا ہے۔ اس افسانے میں بھی دو بنیادی کردار ہیں۔ یہ کہانی

عراق میں موجود دو امریکی فوجیوں کے گرد گھومتی ہے۔ جیمز اور ٹونی دو امریکن فوجی ہیں جو بیٹھے آپس میں گفتگو کر رہے ہیں۔ جیمز کا ضمیر جاگ چکا ہے اس لئے وہ امریکہ کی پالیسیوں کو تنقید کا نشانہ بناتا ہے جبکہ ٹونی اس بات پر حیران رہ جاتا ہے۔ ٹونی امریکی حکومت کے اقدامات کی حمایت کرتا ہے جبکہ جیمز جو کہ انسانی دل رکھتا ہے اس کو عراقیوں سے بحیثیت انسان ہمدردی ہیوہ ایک ہوٹل سے فرائیڈ چکن خریدتے ہیں اور ٹونی مزے لے کر کھاتا ہے ساتھ وہ جیمز کے بارے میں فکر مند رہتا ہے کہ امریکی انٹیلی جنس ادارے اس کو پکڑ نہ لیں۔ پھر دونوں بغداد کی تاریخ پر بحث کرتے ہیں جس کے دوران ہلاکو خان کا ذکر بھی آتا ہے۔ ٹونی ہلاکو خان کے اقدامات کی حمایت کرتا ہے جبکہ جیمز مخالفت کرتاے۔ اگلے منظر میں جیمز جب ٹی وی چلاتا ہے تو اس کو پتہ چلتا ہے کہ فلوجہ میں عراقیوں نے امریکی افواج پر حملہ کیا جس کے نتیجے میں کئی فوجی مارے گئے۔ ان ہی میں ایک فوجی ٹونی بھی شامل تھا جس کو لوگ گھسیٹ کر لے جارہے تھے۔ پھر ٹونی کی لاش پر کسی نے پھبتی کسی، فرائیڈ چکن۔ تو جیمز کو فوراًہی وہ فرائیڈ چکن یاد آگیا جو اس نے اور ٹونی نے مزے لے کر کھایا تھا۔ اس احساس نے اس کو کرب میں مبتلا کر دیا یہاں تک پہنچتے ہوئے افسانے میں جو اصل مفہوم پنہاں ہے وہ واضح ہو جاتا ہے۔ ایک طرف جنگ زدہ عراق کی تصویریں ہیں تو دوسری طرف امریکہ کے افراد کا ردعمل بھی سامنے آتا ہے۔ جیمز ایک ہمدرد دل کا مالک ہے وہ امریکی حکومت کے اقدامات کو منفی قرار دیتا ہے جبکہ ٹونی ان اقدامات کی حمایت کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ عراق کی جنگ کو لے کر امریکی عوام بھی دو طبقوں میں بٹ چکی تھی، یہ دو کردار امریکی عوام کی تقسیم کو طشت کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ آخر میں جو انجام ٹونی کا ہوا وہ بہت قابل افسوس ہے کیونکہ یہ سراسر غیر انسانی سلوک تھا۔ یہ دراصل عراقیوں کے اندر پائے جانے والے انتقام کی عکاسی کرتا ہے۔ ظلم کسی بھی نوعیت کا کسی کے ساتھ بھی ہو وہ قابل مذمت ہے، اس طرح یہ نائن الیون کے پس منظر میں لکھا گیا ایک اہم افسانہ ہے جو نائن الیون کی دوسری جہت کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ جہت کہ ظلم کو ظلم کے ذریعے نہیں ختم کیا جا سکتا، جو آپ بوئیں گے وہی کاٹو گے۔ عراق میں جو امریکی افواج نے کیا، پھر ٹونی کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ اس دعویٰ کو درست ثابت کرتا ہے کہ ظلم کی کاشت سے ظلم ہی پیدا ہوتا ہے۔

افسانہ نگار علی حیدر ملک نے بھی دہشت گردی کو ایک افسانے میں موضوع بنایا ہے۔ ان کا افسانہ

'دہشت گرد چھٹی پر' نائن الیون کے بعد معمولات زندگی میں پیدا ہونے والی تبدیلی کی عکاسی کرتا ہے۔ یہاں پر بیرونی دہشت گردوں سے زیادہ ملک کے اندر وہ تمام ادارے جو عوام کی حفاظت پر معمور ہیں وہ استحصال کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہر ایک فرد کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ 'دہشت گرد چھٹی پر' اس میں ایک مرکزی کردار جمیل شیرازی ہے۔ وہ ایک مذاکرے میں اس موضوع پر گفتگو کرتا ہے 'دہشت گرد چھٹی پر ہیں' یہ فقرہ اس نے مذاکرے میں اپنی تقریر کے دوران ادا کیا تھا۔ مذاکرے کا موضوع تھا۔۔۔۔ ''دہشت گردی: اسباب اور تدارک کی تدابیر'' جس کا انتظام ایک این جی او نے کیا تھا۔[۱۱]

جب جمیل شیرازی مذاکرے میں شرکت کرنے کے بعد گھر کے لئے روانہ ہوتا ہے تو وہ گھر نہیں پہنچتا۔ اس کی بیوی تھانے کا رخ کرتی ہے۔ وہاں جا کر وہ ایس ایچ او کو ایف آئی آر درج کرنے کو کہتی ہے۔ پولیس والا ایف آئی آر درج نہیں کرتا بلکہ وہ ٹال دیتا ہے کہ ایسی چھوٹی باتوں پر ایف آئی آر درج نہیں کی جاتی۔ پھر جمیل شیرازی کی بیوی ایک پریس کانفرنس بلاتی ہے وہ اپنا مسئلہ میڈیا کے سامنے رکھتی ہے۔ میڈیا والے کسی حد تک اس کو کوریج بھی دیتے ہیں لیکن اس کے خاوند کی کوئی خبر نہیں ملتی۔ ایک دن پولیس والے یہ بیان جاری کرتے ہیں کہ جمیل شیرازی نام کا کوئی بندہ ان کی تحویل میں نہیں ہے۔ اس کے دوسرے دن جمیل شیرازی کی گولیوں سے چھلنی لاش سپرہائی وے کے کنارے سے ملتی ہے۔ اس پر شہر میں احتجاج شروع ہوتا ہے۔ شہر میں ایک معروف سماجی کارکن عباس غوری تقریر کرتے ہوئے کہتا ہے۔ ہم دہشت گردوں کے رحم و کرم پر ہیں وہ جب جہاں اور جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ دہشت گردی کے نام پر جب تک اصل مجرموں کی بجائے بے گناہ لوگوں کو پکڑ کر سزا دی جاتی رہے گی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔[۱۲]

بعد میں عباس رضوی بھی گھر نہیں پہنچتا۔ پھر اس کے رد عمل میں احتجاج کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں پہنچ کر مصنف کہانی ختم کر دیتا ہے۔ یہاں تک پہنچتے ہوئے کہانی کار فنکارانہ انداز میں یہ تاثر دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے کہ یہ نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے جو جاری و ساری رہے گا۔ دراصل سکیورٹی ادارے عوام کے نجی معاملات میں دخل اندازی کرتے ہیں۔ بعض اوقات معمولی شک پر اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ یہ دراصل اس جہت کی طرف اشارہ ہے کہ عوام کی حفاظت پر جو لوگ مامور ہیں انہیں کے ہاتھوں سے عام لوگوں کی جانوں کا ضیاع ہو رہا ہے۔

محمد حمید شاہد نے بھی اپنے افسانوں میں نائن الیون کے بعد کی صورت حال کو پانے افسانوں میں موضوع بنایا ہے۔ انہوں نے بھی تمثیلی انداز میں معاصر صورتحال کی ترجمانی اپنے افسانے 'سوَرگ میں سوز' میں کی ہے۔ حمید شاہد نے اپنی کہانی میں ایک بستی دکھائی ہے جس میں بستی والوں نے بکریوں کے ریوڑ پال رکھے ہیں لیکن کچھ عرصے بعد ایک نئی صورتحال بستی والوں کو درپیش آجاتی ہے۔ جنگلی سور بکریوں پر حملے کرنے شروع کر دیتے ہیں بستی والے اس کا حل یہ نکالتے ہیں کہ کچھ کتے پال لیتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان سوروں کی تعداد میں ہوشربا اضافہ ہونا شروع ہو جاتا ہے بستی والے کچھ کتے اور پالتے ہیں لیکن یہ کتے بھی سوروں کے ساتھ مل جاتے ہیں اور تمام حفاظتی تدابیر کارگر ثابت نہیں ہوتیں۔ افسانے کے شروع میں جب حمید شاہد یہ کہتے ہیں: جب سے تھوتھنیوں والے آئے ہیں، دکھ موت کی اذیت سے بھی شدید اور سفاک ہو گئے ہیں۔ (۱۳)

یہ تھوتھنیاں دراصل مغربی استعمار کے لئے ایک بامعنی استعارہ ہے کہ انہوں نے عالمی گاؤں بنانے کے نام پر کس طرح دنیا کے نقصانات کئے ہیں۔ انہوں نے انسانی خون کو پانی سے بھی ارزاں سمجھ کر بہایا ہے۔ امریکہ نے عراق اور افغانستان میں جو کچھ کیا وہ متذکرہ بالا سوروں والی ہی حرکات نظر آتی ہیں۔ نائن الیون کے پس منظر میں اردو میں بڑی تعداد میں اضافے تخلیق ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف نے اپنی کتاب میں مجموعی طور پر بائیس افسانے مرتب کئے ہیں۔ تمام افسانوں کے مطالعے کے بعد یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ یہاں کے لکھاریوں نے اس کرب کو پوری طرح محسوس کیا ہے جس میں یہاں کے عوام مبتلا ہوئے ہیں۔ اردو افسانے کی یہ خوبی ہے کہ وہ تاریخ کے ہر نئے موڑ پر زمانے کے ساتھ قدم ملا کر چلتا ہے۔ دنیا میں رونما ہونے والے کسی بھی واقعے کو اردو کے افسانے نے اپنانے میں دیر نہیں کی ہے۔ مغرب میں رونما ہونے والی تحریکوں کے اثرات بھی اردو افسانے میں موضوعاتی، فکری اور فنی سطحوں پر نمودار ہوئے۔ اس لیے ہمیں ڈاکٹر سلیم اختر کی اس بات سے اتفاق کرنا پڑتا ہے جو انہوں نے بہت پہلے کہی تھی:

> "عصری آگاہی کے نقطہ نظر سے جب پون صدی پر محیط افسانے کا افسانہ سنیں تو یہ محسوس ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ہماری تاریخ کے ہر موڑ پر ہماری تہذیب کی ہر کروٹ پر ہمارے تمدن کے ہر تغیر پر کہانی نے زندگی کا ساتھ دیا۔" (۱۴)

اس بات میں کسی بھی شک کی گنجائش نہیں کہ اردو افسانے نے تاریخ کے ہر موڑ کے ہر رنگ کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ قدیم دیہاتی زندگی سے لے کر جدید شہری زندگی تک کے تمام عناصر کو اردو افسانے نے اپنے اندر سمونے کی کوشش کی ہے۔ پریم چند کی حقیقت نگاری اور یلدرم کی رومانیت سے شروع ہونے والا اردو افسانے کا سفر آج بہت رنگارنگ ہو چکا ہے۔ کہانی بیان کرنے کی کئی ٹیکنیکس آچکی ہیں۔ موضوعاتی سطح پر بھی کئی تبدیلیاں آئی ہیں۔ اس طرح افسانے کی تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے تو کبھی بھی یک رنگی کا احساس نہیں ہو گا۔ اردو افسانے کی اس ہمہ گیر خوبی کے بارے میں ڈاکٹر رشید امجد نے بھی رائے دی ہے:

> "اردو افسانے نے چاہے، آزادی اظہار کے مسائل ہوں، چاہے مارشل لائی جبر کے معاملات ہوں، یہاں تک کہ ۱۱/۹ اور اس کے بعد کی صورتحال ہو، تمام عصری مسائل کو عصر آگہی کے ساتھ پیش کیا ہے۔"(۱۵)

اردو کے دو معتبر تخلیق کاروں اور ناقدین کی آراء سے متفق ہوئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ اردو کے معاصر افسانے پر بھی نائن الیون کے اثرات واضح ہیں۔ نائن الیون کے بعد رونما ہونے والی صورتحال اور معاشرے میں پایا جانے والا ڈر اور خوف واضح طور پر نئے افسانوں میں نظر آتا ہے۔

ب۔ معاصر اردو افسانہ اور نائن الیون:

اس سے قبل بحث سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ گیارہ ستمبر کے واقعے کے رونما ہونے کے فوراً بعد یہ اثرات ہمیں ادب پر دکھائی دینے لگے۔ کچھ افسانوں میں تو براہ راست یہ موضوع نظر آتا ہے اور کچھ میں بلواسطہ اس کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ ۲۰۱۰ء میں جب اس سانحے کو نو سال گزر چکے تھے اسکے بعد بھی تخلیق کاروں کے ہاں یہ اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ نائن الیون کے ان دیرپا اثرات کا جائزہ آئندہ آنے والے صفحات میں مندرجہ ذیل موضوعات کے تحت کیا جا رہا ہے۔

i۔ امن و امان کی خراب صورتحال کی عکاسی:

نائن الیون کے بعد حالات یکسر تبدیل ہو گئے ہیں۔ اب شہر پر امن نہیں رہے بلکہ قدم قدم پر موت نظر آتی ہے۔ انسانی خون بہت ارزاں ہو چکا ہے۔ امن و امان کی صورتحال اب اس نہج پر پہنچ چکی ہے کہ انسان

کسی بھی جگہ پر محفوظ نہیں ہے۔ وہ دفتر میں، مسجد میں، چوک میں اور بازار میں کسی بھی جگہ محفوظ نہیں۔ ظاہر ہے ایک ادیب جو اس معاشرے کا حصہ ہے وہ اس کیفیت کو باقی لوگوں کے بر خلاف زیادہ بہتر انداز سے سمجھ سکتا ہے۔ پھر اپنے جذبات کی تحریک سے وہ اپنی سوچ کو صفحہ قرطاس پر رکھتا ہے۔ ادب کسی بھی قوم میں پائے جانے والے حالات کا آئینہ ہوتا ہے۔ اگر دہلی کی تباہی کا ذکر میر کی شاعری میں پایا جاتا ہے، اکبر آباد کی زبوں حالی کا ذکر نظیر اکبر آبادی کے ہاں موجود ہے، غالب کے خطوط اس کے عہد کی تصویریں پیش کرتے ہیں تو آج کا ادیب کس طرح معاشرے کی عکاسی میں پیچھے رہ سکتا ہے۔ زمانی ترتیب کے ساتھ اگر ادبیات پر نظر ڈالیں تو افسانہ نگار نورالہدیٰ شاہ کا افسانہ 'سات آسمانوں تلے' اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ جس میں امن و امان کی خراب صورتحال کی عکاسی کی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو: عین اس لمحے سامنے سے ایک شخص نمازیوں کو دھکیلتا اللہ اکبر کا نعرہ لگاتا ہوا، مسجد کی سمت دوڑتا ہوا آیا اور دفعتاً مجھ سے ٹکرایا اور بم پھٹ گیا۔[۱۶]

یہ کہانی واحد متکلم کے صیغے میں بیان کی گئی ہے۔ کردار بنیادی طور پر قبائلی نظام پر تنقید کرتا ہے جس میں انتقام کی آگ اس قدر شدید ہوتی ہے کہ پورے خاندان کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ اس کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایک کردار مزید ہے جس سے اولذکر کردار اپنی زندگی کی کہانی بیان کرتا ہے۔ آخر میں جب مسجد میں دھماکہ ہوتا ہے تو ایک کردار دوسرے سے پوچھتا ہے کہ تمہاری لاش کدھر ہے وہ جواب دیتا ہے: "کہنے لگا میری کیسی لاش! میں تو بوٹی بوٹی ہو گیا تھا۔"[۱۷] اس جملے نے ہمارے عہد کے المیے کو پوری طرح بیان کر دیا ہے کہ کس طرح اللہ کے گھر میں بھی انس محفوظ نہیں رہتا۔ آئے روز مسجدوں میں ہونے والے دھماکوں میں مرنے والے انسانوں کے اجسام بوٹی بوٹی میں بٹ جاتے ہیں۔ انسانی خون کی اس قدر ارزانی شروع ہی سے افسانے کے کردار کو کھٹکتی ہے اور آخر میں وہ بھی ایک مسجد میں نماز ادا کر رہا ہوتا ہے تو اچانک حملہ آور آکر دھماکہ کر دیتا ہے۔ مرکزی کردار اور ثانوی کردار کی ارواح آپس میں گفتگو کرتی ہیں۔ مرکزی کردار ثانوی کردار سے پوچھتا ہے تمہاری لاش کدھر ہے جو جواباً متذکرہ بالا جملہ کہا گیا ہے۔ انسانی خون کو اس بے دردی سے بہایا جا رہا ہے کہ یہ انسانیت کی توہین ہے۔ اس افسانے کا اثر بہت دیرپا ہے۔ اب صورتحال پر غور کرنے کی اشد ضرورت ہے کہ کیا یہ مساجد کو نشانہ بنانے والے بھی ہمارے دین کے پیروکار ہو سکتے ہیں۔ اس کا نام قطعی جہاد نہیں ہو سکتا لیکن امریکہ اور اس کا ساتھ دینے والے ممالک دولت کے بل بوتے پر ہمارے

ہی لوگوں کو خرید کر ہم ہی پر حملے کرواتے ہیں یہ سب معاملات ۱۱/۹ کا شاخسانہ ہی ہیں۔ امن و امان کی خراب صورتحال پر طاہرہ اقبال نے بھی ان الفاظ میں بحث کی ہے:

> " تسبیح کے دانے شمار کرنے والی انگلیاں گولے اور میزائل داغ رہی ہیں توپوں کی نالیاں شعلے اگل رہی ہیں الجہاد۔۔ الجہاد۔۔۔ الامان۔۔۔ لوگ بھاگ رہے ہیں۔ گردنوں میں دربدری کے طوق لٹکے ہوئے ہیں۔ آنکھوں میں ویرانیوں اور وحشتوں کے الاؤ جلتے ہیں۔ عظیم طاقتوں کی ایجادوں سے پنہاں نہیں۔ بچے باپ سے محروم، ماؤں سے بچھڑے ہوئے، کسی کا ہاتھ ندارد، کسی کی ٹانگ اڑی ہوئی ہے"۔[۱۸]

معاصر افسانے میں امن و امان کی اس خراب صورتحال کی عکاسی مندرجہ ذیل اقتباس میں بھرپور انداز میں کی گئی ہے۔ مسجدیں جو سکون و قلب کا سامان ہوتی تھیں، عبادات گزار افراد ان کی رونقیں بڑھاتے تھے اب وہ افراد میں دہشت گردی کی بھینٹ چڑھ گئی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تشدد کرنے والوں کا مذہب نہیں ہوتا نہ ہی ان کے سینے میں انسان کا دل ہوتا ہے۔ کئی دھماکے ایسے ہوتے ہیں جن میں خاندان کے خاندان لقمہ اجل بن جاتے ہیں جبکہ کئی والدین اپنے بچوں سے محروم ہو جاتے ہیں اور بڑھاپے کے سہارے کو یہ ظالم ختم کر کے پوری عمر کے لئے صدمہ بنا دیتے ہیں۔ کئی بچوں کے سروں سے والدین کا سایہ اٹھا دیا جاتا ہے اور وہ شفقت پدری سے محروم ہو جاتے ہیں۔ 'سات آسمان تلے' افسانے میں ان تمام جہات کا احاطہ مصنف نے کیا ہے۔

معاصر لکھنے والوں میں فرخ ندیم بھی ایک اہم نام ہے۔ ان کا افسانہ 'کچھ لکھنے سے پہلے' بھی امن و امان کی خراب صورتحال کو واضح انداز میں بیان کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس افسانے میں بھی یہی دکھائی دیتا ہے کہ امن و امان کی صورتحال اس قدر خراب ہے کہ انسان اب کسی بھی جگہ محفوظ نہیں رہتا بلکہ کسی بھی جگہ جہاں بھی انسان ہو وہاں پر خطرہ موجود رہتا ہے۔ دھماکوں کے بعد کی صورتحال اتنی دردناک ہے کہ وہ بیان سے باہر ہے۔ اس افسانے 'کچھ لکھنے سے پہلے' میں اس صورتحال کی عکاسی کی گئی ہے۔ انسانی جانوں کے زیاں کو ایسی تشبیہ دی گئی ہے جیسے تسبیح کے دانے فرش پر گر کر بکھر جاتے ہیں۔ پھر انسانوں کے اجسام کے ٹکڑے ادھر ادھر بکھر جانا بھی کتنا اذیت ناک عمل ہے۔ اس کیفیت کی عکاسی ان الفاظ میں کی گئی ہے:

"ایک دھماکہ ہوا اور زندگی ٹوٹ کر یوں بکھری جیسے مسجد کے فرش پر تسبیح کے منکے یا طوفانی زلزلے میں بے بس بستیاں پہاڑوں سے گرتی پرکھوں کی ہڈیاں تک ہلا دیتی ہیں۔"(۱۹)

اس افسانے میں انسانی جسموں کی پامالی کی دردناک تصویر ابھر کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ انسانی جسم اس طرح ٹکڑوں میں بٹ جاتاے جس طرح شیشہ ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے۔ اس سے آگے چل کر اس افسانے میں ایک اور صورتحال کی بھرپور ترجمانی کی گئی ہے۔ یہ مسئلہ ہمارے ملک کو بھی درپیش ہے کہ منفی خبر کوئی ٹی وی اور اخباری ذرائع فوراً اچھال کر پیش کرتے ہیں۔ خبریں اس طرح گلا پھاڑ کر سنائی جاتی ہیں کہ کانوں کے پردے تک لرز جاتے ہیں۔ دراصل اس افسانے ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری قوم جذباتی ہے۔ اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکتی، اب ہم دیکھتے ہیں کہ: "ملکی، غیر ملکی اور نجی ٹیلی ویژن پھاڑ پھاڑ کر بول رہے تھے کہ پاکستان چوک میں الامان کے پرخچے اڑ چکے ہیں۔"(۲۰)

یہ جملے ہمارے جذباتی رویوں کی بھرپور نشاندہی کرتے ہیں۔ خبروں کو اس انداز سے سنایا جاتا ہے کہ دیکھنے والے اور پریشان ہو جاتے ہیں۔ صحافت جو کہ ایک معتبر شعبہ ہے اس میں مبالغہ عروج پر ہے، خبریں بڑھاچڑھا کر پیش کی جاتی ہیں۔ اس ضمن میں احتیاط کی ضرورت ہے۔

دھماکوں کے بعد فوری طور پر جو کچھ اطراف کی عمارتوں کے ساتھ ہوتا ہے اس کی عکاسی بھی ہمیں متذکرہ بالا افسانے میں نظر آتی ہے۔ ہمارے مشاہدے میں یہ بات آئی ہے کہ جب دھماکہ ہوتا ہے آس پاس کی عمارات بھی متاثر ہوتی ہیں اور اطراف کے لوگوں پر بھی ایک خوف طاری ہو جاتا ہے۔ انسانی اعضاء اس طرح کٹ جاتے ہیں اور بکھر جاتے ہیں کہ ان پر ملبے کا گمان گزرتا ہے۔ اس خوفناک صورتحال کا تذکرہ بھی افسانے میں ہوا ہے۔ پھر لوگوں پر جو دہشت طاری ہوتی ہے اس کا گمان آتے ہی انسان کانپ جاتا ہے۔ جس جگہ یہ دھماکہ ہوتا ہے وہاں پر عجیب قسم کی قیامت برپا ہو جاتی ہے، دھماکے اپنے پیچھے صرف تباہی کے مناظر چھوڑتے ہیں۔ ان کے بعد صرف آس اور سسکیاں باقی رہتی ہیں۔ فرخ ندیم نے متذکرہ بالا تمام کیفیات کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"دھماکہ ہوا اور کئی من جسمانی ملبہ چھوٹی، بڑی، سفید، کالے شیشوں والی گاڑیوں پر اس

شدت سے سرخ تھپڑ برسانے لگا کہ سب الٹے ٹائروں کی چیخیں نکالتے بیک مرر کے
سہارے مڑتے ہوئے ورکشاپوں میں کھانس کھانس کر سانسیں بحال کرنے لگے۔"(۲۱)

دراصل نائن الیون کے بعد امریکہ نے افغانستان اور عراق پر حملے کئے۔ اس کے بعد ان ممالک کے حالات ایسے ہی کچھ ہو گئے کہ وہاں پر آئے روز دھماکے معمول بن گئے۔ شر پسند عناصر نے مضبوط اور منظم نظام کو کچوکے لگائے جس کی وجہ سے نظام کی بنیادیں کمزور ہو گئیں۔ اردو افسانہ نگاروں نے ان تمام موضوعات کا احاطہ احسن طریقے سے کیا ہے۔ آج کے قاری اور لکھاری کے ذہن میں اپنے عصر کا گہرا شعور ہے۔ جب کوئی ایک واقعہ رونما ہوتا ہے تو فکشن نگار اس کی تمام جہات کا احاطہ کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ کی ان وحشیانہ کارروائیوں کے بعد کی صورتحال نے تمام ادیبوں کو اپنے اپنے طور پر متاثر کیا اور انہوں نے اپنی تخلیقات میں اس کی عکاسی بھی کی ہے۔ امریکہ نے صرف افغانستان اور عراق پر حملے میں ہی طمانیت محسوس نہیں کی بلکہ پاکستان پر بھی اس نے دباؤ ڈالا اور جس فصل کو جنرل ضیاء الحق کے دور میں بویا گیا اب وہ خاردار جھاڑیوں کی شکل اختیار کر چکی ہے جو اپنے پرائے کا فرق جانے بغیر صرف تشدد ہی کو نصب العین بنائے ہوئے ہے۔ پاکستان نے امریکہ کا اتحادی بن کر بہت نقصان اٹھائے ہیں۔ ڈرون حملوں کی صورت میں طاعون کو بھی ہم نے دعوت دی ہے۔ خودکش دھماکے کی بلا بھی اب ہماری زندگی کا حصہ بن چکی ہے۔ متذکرہ بالا تمام موضوعات کو فکشن نگاروں نے اپنے انداز سے بین کیا ہے۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر نجیبہ عارف رقم طراز ہیں:

"وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس اہم واقعے کے کئی دوسرے پہلو بھی فکشن کا
موضوع بننے لگے۔ ان میں افغانستان پر وحشیانہ امریکی بمباری اور عراق پر حملے کی
وجوہات سے لے کر پاکستان میں خودکش حملوں اور بم دھماکوں کی تیزی سے بڑھتی
ہوئی لہر۔۔۔۔ افسانہ نگاروں کی بھرپور توجہ کا مرکز رہے ہیں۔"(۲۲)

دراصل یہ ایک بیماری ہے جو ہمارے ملک کو بھی لگ چکی ہے۔ یہ بیماری ہم نے باہر سے درآمد کی ہے۔ فرخ ندیم نے اپنے افسانے میں واضح طور پر کہا ہے کہ یہ بیماری ہے جو ہمارے ملک کے خوبصورت بدن کے

ساتھ لگ گئی ہے جو ملک کا خون نچوڑ رہی ہے۔ بات بات پر ملک میں ایمر جنسی نافذ ہو جانا، امن و امان کی خراب صورتحال ہی کی وجہ سے ہے: "سنا ہے شہر میں بم پھٹتا ہے تو خون کی بارش ہوتی ہے اور کوئی بیماری بھی ہے ایمر جنسی جو ہمارے ملک کو لگی ہوئی ہے۔"(۲۳)

یہ دراصل ہے مرض جو ہمارے خوبصورت ملک میں امریکہ نے لا کر چھوڑا ہے۔ کوئی بھی لکھاری ان حالات سے بے خبر نہیں رہ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان حالات کو اپنی تخلیقات میں سمونے کی کوشش کرتا ہے اور یہ رنگ ہمیں تمام افسانہ نگاروں کے ہاں کبھی گہرا اور کہیں مدھم سے نظر آتا ہے۔ 'ادبیات' کے شمارہ نمبر ۱۰۰ ہی میں ایک اور افسانہ 'فریم سے باہر' نظر آتا ہے جو کہ عرفان عرفی کے قلم کا معجزہ ہے۔ افسانہ نگار نے استفہامیہ انداز میں اپنے معاصر کے بارے میں اہم سوالات اٹھائے ہیں۔ جب کسی بھی جگہ کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے تو افسانہ نگار کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات جنم لیتے ہیں۔ عرفان عرفی نے ایسے سوالات اٹھائے ہیں جو معاصر زندگی کا نوحہ قرار دیئے جاسکتے ہیں: یہ تو بتاؤ آج سنا ہے پھر دھماکہ ہوا ہے۔ کتنے مارے گئے؟ کتنی ماؤں کی گودیں اجڑ گئیں؟ آخر یہ کب تک ہوتا رہے گا۔ چھوڑیں آنٹی! یہ روز کی بات ہے۔(۲۴)

اس اقتباس سے معاصر عہد کے حالات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ دراصل روز روز کے دھماکوں نے ہمیں بے حس کر کے رکھ دیا ہے اب ہم پر ان چیزوں کا وہ اثر نہیں پڑتا جو شروع میں تھا۔ نائن الیون کے بعد روز روز یہ جو سلسلہ چل نکلا ہے جانے کب ختم ہو گا۔ اس ناسور کو کیسے ختم کیا جائے کہ لوگ امن و امان کی زندگی سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکیں۔

جہاں تک پاکستان کی بات ہے تو نائن الیون کے بعد پشاور شہر بالخصوص متاثر ہوا ہے۔ آئے روز وہاں پر دھماکے ہوتے ہیں۔ پاکستان کو اندرونی طور پر کمزور کرنے کے لئے شر پسند عناصر ہر وقت سرگرم دکھائی دیتے ہیں۔ اس عہد کے افسانے ہی نہیں بلکہ ادب کی ہر صف پر یہ اثرات واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ زبیدہ ذوالفقار کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

> "پشاور پاکستان کا خوبصورت اور روایتی قدروں کا حامل شہر ہے۔ ۹/۱۱ کے بعد عالمی پروپیگنڈے کی زد میں آنے والا بدنصیب شہر جس کے حسن، امن اور سکون کو آئے دن پر تشدد واقعات نے تہس نہس کر دیا ہے، آئے روز ہونے والے دھماکوں، ڈرون

حملوں، ان دیکھی ہزیمتوں نے بچے بچے کے اندر خوف کی وہ فصل بو دی ہے جس کو
کاٹتے کاٹتے ہاتھ شل ہو جائیں گے لیکن یہ امر بیل کی طرح بڑھتی رہے گی۔"(۲۵)

نائن الیون کے بعد پاکستان میں امن و امان کی صورتحال خطرناک حد تک خراب ہے۔ متذکرہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاندار روایات اب قصہ پارینہ بن چکی ہیں۔ پشاور جیسے خوبصورت شہر میں آئے روز ہونے والے واقعات نے شہر کو اقتصادی طور پر بہت متاثر کیا ہے۔ دراصل یہ بھی عالمی طاقتوں کی شے پر ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے ان شدت پسندوں کو اس قدر اسلحہ فراہم کون کرتا ہے یہ ایک سوالیہ نشان ہے۔ اس جہت کی نشاندہی بھی معاصر افسانے میں واضح طور پر نظر آتی ہے۔

خالد فتح محمد عصر حاضر کے ایک اہم لکھاری ہیں۔ ان کے افسانوں میں عصری آگاہی کے خوبصورت مرقعے جابجا بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ امن و امن کی خراب صورتحال کی عکاسی انہوں نے اپنے افسانے 'اور طرح کی جنگ' میں کی ہے۔ دہشت گردی کی اس نحوست نے انسان کو عدم تحفظ کا احساس دلایا ہے۔ انسان کسی بھی مجمع میں جاتا ہے تو وہاں خطرہ محسوس کرتا ہے۔ اعلیٰ شخصیات، علماء اور سیاسی شخصیات کی حفاظت پر سکیورٹی مامور کی جاتی ہے اس کے باوجود بھی کئی سانحات رونما ہوتے ہیں۔ اب مصنف نے متذکرہ بالا افسانے میں یہ احساس دلایا ہے کہ کوئی بھی اہم شخصیت امن و امان کی اس ناگفتہ بہ صورتحال کے پیش نظر اپنے گھر سے باہر سکیورٹی کے بغیر قدم نہیں رکھ سکتی:

"بچے ہمارے ارد گرد جمع ہو گئے۔ ان کی آنکھوں میں معصومیت، جارحیت، محرومی
اور اشتیاق تھا۔ مجھے اپنے جسم میں کپکپی سی محسوس ہوئی۔ مجھے احساس ہوا کہ اپنے
سکیورٹی گارڈز کے ساتھ آنا چاہیئے تھا۔"(۲۶)

آج کے فرد کو قدم قدم پر خطرہ نظر آتا ہے یہی وجہ ہے کہ مصنف کو بھی خیال آتا ہے کہ سکیورٹی کے بغیر باہر نہیں نکلنا چاہیئے۔ دوسری بات انسان کو شک و شبے کی نظر سے دیکھنا بھی عام رواج بن چکا ہے کہ ہر فرد اس بدامنی کی صورتحال میں دوسرے پر شک کرتا ہے جس کے باعث افراد میں باہمی تفہیم عنقا نظر آتی ہے۔

شمارہ سو ہی میں آگے چل کر اخلاق احمد نے ایک اور جہت کی نشاندہی کروائی ہے کہ جب کسی دھماکے میں کسی فرد کا پورا خاندان موت کی وادی میں دھکیل دیا جاتا ہے وہ اپنی زندگی کیسے بسر کرتا ہے۔ اس کی زندگی تو اجیرن ہو جاتی ہے۔ اپنوں کے بغیر جینے کے خیال تک سے انسان کانپ جاتا ہے لیکن ہمارے ہاں ایسا روزمرہ کا معمول بن چکا ہے کہ ایک گھر کے کئی لوگ دھماکوں میں مارے جاتے ہیں: "ایک بم دھماکے میں جس آدمی کا پورا خاندان فنا ہو جاتا ہے وہ کیا باقی زندگی کسی معاشرے یا رشتے کے بغیر گزارتا ہے۔"(۲۷)

دراصل ان تمام بلاؤں کو ہم نے خود دعوت دی ہے۔ امریکہ جو اسلام کا ازلی دشمن ہے وہ تو پاکستان کو ترقی کرتا نہیں دیکھ سکتا۔ طاقت کے نشے میں چور پاکستان کو دبانے کی کوشش کرتا ہے۔ پہلے اڈے استعمال کر کے افغانستان پر حملہ کیا۔ پھر افغانستان سے پاکستان کی سرحدوں پر ڈرون حملے۔ یہی امن و امان کی خرابی کی سب سے بڑی وجہ نظر آتی ہے۔ اس بارے میں طاہرہ اقبال نے اپنی کتاب 'پاکستانی اردو افسانہ سیاسی و تاریخی تناظر میں' لکھا ہے:

> "پھر اس کے بعد Do More اور Yes Sir کی ایک لمبی گردان چلی، جس نے ملک کے امن و امان کو نیست و نابود کر دیا۔ یہاں صنعتیں اجڑ گئیں، سرمایہ کار اپنا مال سمیٹ کر اڑنچو ہو گئے۔ تعلیمی ادارے، سرکاری املاک، سکیورٹی فورسز کی عمارتیں بارود بھرے ٹرکوں اور بمباروں سے اڑائی جانے لگیں۔"(۲۸)

امن و امان کی اس خراب صورتحال نے معاصر انسان کو ہر جگہ خطرے میں مبتلا کر دیا ہے۔ انسان کسی بھی جگہ محفوظ نظر نہیں آتا۔ پاکستان نے تو اس جنگ میں ناقابل تلافی نقصان اٹھایا ہے۔ اس کے بعد بازاروں میں مندی نظر آتی ہے۔ کھیل کے میدان بھی خالی نظر آتے ہیں۔ اس بات میں قطعی کوئی شک نہیں: "ہماری سڑکیں اور بازار قتل گاہیں بن گئے، کھیل کے میدانوں میں خاموشی چھا گئی اور انسانوں کے چیتھڑے فضاؤں میں اڑنے لگے۔"(۲۹)

آگے چل کر شمارہ ۱۰۳ میں حامد سراج کا ایک افسانہ 'کالی دیواریں' شامل ہے۔ اس افسانے میں موجودہ دور کی فرقہ واریت کو واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ فرقہ واریت نے بھی تشدد کو ہوا دی ہے۔ بھائی بھائی کا گلا کاٹ رہا ہے۔ ایک مکتبہ فکر والے دوسرے مکتبہ فکر کو برداشت نہیں کر سکتے۔ کہانی کا مرکزی کردار

ایک نئی بستی میں جا کر وہاں دیکھتا ہے کہ مسجدوں کو تالے لگے ہوئے ہیں۔ وہ ایک عورت سے پوچھتا ہے کہ اس کی وجہ کیا ہے وہ جواب دیتی ہے یہاں کوئی بھی اللہ کا گھر نہیں ہے اور یہ انکشاف کرتی ہے کہ اس کے تین بچے فرقہ واریت کی بھینٹ چڑھ گئے۔ وہ جب واپس اپنے میزبان کے کمرے میں لوٹتا ہے تو دوسرے کمرے سے یہ آواز اس کے کانوں میں پڑتی ہے:

> "جن دس کا چناؤ ہم نے کیا ہے یہ پچیس ہزار پر بھی بھاری ہیں۔ ایک ایک ان کا نامور ہے۔ ڈاکٹر، انجینئر، عالم، سکالر، پروفیسر، رائٹر، بزنس مین، چیئرمین، سیاستدان اور چوٹی کا مبلغ۔۔۔ تم فکر نہ کرو۔"(۳۰)

یہ اس عہد کا ایک بڑا المیہ ہے جس نے نائن الیون کے بعد ہی سر اٹھایا ہے۔ یہ بھی دراصل کسی بڑی سازش کا شاخسانہ ہے کہ مسلمانوں میں باہم پھوٹ ڈال دی گئی ہے۔ اس طریقے سے مسلمان مسلمان کا گلا کاٹنے پر کمربستہ ہو گیا ہے۔ افسانے کے آخر میں میزبان بتاتا ہے کہ یہ ریکارڈنگ ہے جو تم دوسرے کمرے سے سن رہے ہو۔ لیکن ہے حقیقت کہ کوئی ہمارا ایسا دشمن موجود ہے جو ہم میں فرقہ واریت کو ہوا دینے کی پوری سعی کرتا ہے۔ اس طرح بڑے بڑے فنکاروں اور دوسرے تمام شعبہ علوم میں نمایاں کارکردگی دکھانے والوں کو نشانہ بنا کر موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ یہ کتنا المناک ہے کہ جب کسی قوم کے اہم افراد ہی محفوظ نہ ہوں۔ یہ دراصل امن و امان کی خرابی کی انتہائی بدتر صورتحال ہے جس پر دل کڑھتا ہے۔ کراچی پاکستان کا ایک اہم صنعتی اور تجارتی شہر ہے جب سے اس دہشت گردی کو ہمارے حکمرانوں نے دعوت دی ہے اس کے بعد اس اہم شہر کو گویا نظر لگ گئی ہے۔ صوبائی تعصبات کو اتنا اچھالا جاتا ہے کہ وہ فسادات کی صورت اختیار کر لیتے ہیں: "کراچی میں ہمارے لوگوں پر حملے ہونے لگے۔ ان کے ہوٹل جلائے جانے لگے۔"(۳۱)

اس طرح افسانہ نگار دراصل بلوچستان کے لوگوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ ان پر حملے ہونے لگے۔ اس کے پیچھے بھی ان عناصر کے ہاتھ نظر آتے ہیں جو پاکستان کو مضبوط اور مستحکم نہیں دیکھنا چاہتے۔ پاکستان میں ایک اور مسئلہ جس نے سر اٹھالیا ہے وہ اسلحے کی خرید و فروخت کا ہے۔ اس کاروبار نے بہت ترقی کی ہے۔ اسلحے کا عام استعمال امن و امان کی خرابی میں ایک بڑا سبب ہے۔ پچھلے کچھ عرصے سے دہشت گردی کو

مدرسوں کے ساتھ بھی مخصوص کیا گیا۔ اس کی طرف اشارے بھی ہمیں بعض افسانوں میں ملتے ہیں: ''اب اسلحے اور مدرسے کے کاروبار نے بہت سے لوگوں کے دن پھیر دیئے ہیں۔''(۳۲)

اس طرح کے اشارے ہمیں مختلف افسانوں میں نظر آتے ہیں۔ یہ دراصل ہماری کمزوری اور اپنی غلطیاں ہیں کہ مدرسوں جیسی متبرک درسگاہوں کو ہم نے مذموم مقاصد کے لئے کسی دور میں جہاد کے نام پر استعمال کیا اب کچھ عناصر ہمارے لئے گلے کی ہڈی بن چکے ہیں۔

رشید مصباح نے متذکرہ بالا صورت حال کی عکاسی اپنے افسانے 'خاک زادے' میں اس مسئلے پر بہت بحث کی گئی ہے کہ اسلحہ سر عام فروخت ہو رہا ہے۔ پچھلے کچھ سالوں سے اسلحہ جس طرح عام ہر ہاتھ میں دکھائی دیتا ہے یہ ایک بڑے خطرے کی علامت ہے۔ مصنفہ نے پھر تذکرہ کیا ہے کہ مدرسوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ مدرسوں کو چلانے والوں کے دن بھی بہت جلدی پھر گئے ہیں:

> ''ہاں یہاں گزشتہ دو دہائیوں میں دو چیزوں کو بہت فروغ ملا ہے۔ ہر بوڑھے اور نوجوان کے پاس ایک سے بڑھ کر ایک اعلیٰ نسل کا اسلحہ آ چکا ہے اور جہاں بھی چند گھروں کی بستی ہے وہاں دینی مدرسہ کھل چکا ہے۔ ان مدرسوں کو چلانے والے کافی خوشحال ہو گئے ہیں۔''(۳۳)

مندرجہ بالا اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ فرقہ بندی کو مزید ہوا دینے کے لئے چھوٹی چھوٹی بستیوں میں مدرسوں کی کثرت ہے۔ اب نامعلوم ذرائع سے یہ مدرسوں کو چلانے والے لوگ خوشحال ہو رہے ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی بیرونی طاقت ان لوگوں کی مالی امداد کر کے پاکستان کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتی ہے۔ اب تقاضا یہ ہے کہ ان مدارس پر کڑی نظر بھی رکھی جائے اور ان کو باقاعدہ رجسٹرڈ بھی کیا جائے۔ اسلحے کے عام استعمال پر پابندی لگائی جائے تاکہ امن و امان کی صورتحال کو مزید خراب ہونے سے بچایا جاسکے۔

ادبیات کے شمارہ ۱۱۳ میں جمیل حیات کا افسانہ 'صورِ اسرافیل' شائع ہوا ہے۔ یہ افسانہ بھی امن و امان کی خراب صورتحال کی واضح عکاسی کرتا ہے۔ معاصر عہد کا انسان سیر و تفریح سے بھی محروم کر دیا گیا ہے۔ جہاں بھی انسان جاتا ہے اس کو جان کے لالے پڑے رہتے ہیں۔ ایسا ہی ایک کردار متذکرہ بالا افسانے میں ہے

جو اپنی روز مرہ زندگی کی اکتاہٹ اور بیزاری کو کم کرنے کے لئے پارک کا رخ کرتا ہے۔ پارک میں ہر طرف گہما گہمی ہوتی ہے۔ تمام چہرے شاد نظر آ رہے ہوتے ہیں لیکن ان میں ایک شخص ایسا بھی ہوتا ہے جس کا حلیہ قدرے مختلف ہوتا ہے۔ اس نے انتہائی گرمی کے موسم میں چادر اوڑھی ہوتی ہے حالانکہ ایسے موسم میں اس چادر کی قطعی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ موسم خوشگوار تھا۔ جب مرکزی کردار کی آنکھیں اس کی آنکھوں سے ٹکرائیں تو اسے کچھ شک ہو گیا تھا۔ ان آنکھوں کے جذبات کچھ ایسے ہی تھے جن پر شک کی گنجائش موجود تھی۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> "اگلا لمحہ قیامت کا تھا۔ اتنی خوفناک چنگھاڑ۔ اطمینان سے لیٹا وہ چونکا۔ یہ چنگھاڑ۔۔۔۔یہ تو اس وقت آتی تھی جب ۔۔جب قیامت نے آنا تھا تو کیا قیامت۔۔۔بس یہ آخری سوچ تھی۔ ہر طرف چیخ و پکار۔ آگ و خون میں لتھڑے ہوئے معصوم بچے، ارمانوں سے بھری ہوئی خواتین و مرد، سبھی ٹکڑوں میں اس طرح بٹ رہے تھے جس طرح یہ قوم بٹی ہوئی تھی۔"(۳۴)

اس اقتباس میں دراصل امن و امان کی ابتر صورتحال کو زیادہ واضح اور جامع انداز میں مصنف نے بیان کیا ہے۔ دھماکے کے بعد رونما ہونے والی حالت کی عمدہ تصویر ہمارے سامنے پیش کر کے رکھ دی ہے۔ ۹/۱۱ کے بعد رونما ہونے والی یہی صورتحال ہے جس میں انسان جان کی پامالی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ انسان کا خون بہایا جانا بالکل معیوب نہیں سمجھا جاتا بلکہ شر پسند عناصر خون بہانا باعث ثواب سمجھتے ہیں۔ کسی بھی جگہ جب کوئی دہشت گردی کا المناک سانحہ رونما ہوتا ہے وہاں پر بعد کی صورتحال ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ اس صورتحال کی عکاسی متذکرہ بالا اقتباس میں کی گئی ہے۔

اس طرح اس بحث سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ معاصر افسانہ نگار نے روح عصر کو اپنے افسانہ میں پوری شدت کے ساتھ بھر دیا ہے۔ کسی بھی فن پارے کا کوئی بھی حصہ اٹھا کر دیکھ لیں بس اس میں عصر حاضر کے کسی نہ کسی پہلو پر بحث کی گئی ہے۔ ویسے نائن الیون کے ہمہ گیر سانحے کو رونما ہوئے اٹھارہ سال بیت چکے ہیں لیکن اس کے بعد جو واقعات رونما ہوئے۔ انہوں نے فرد کو بری طرح متاثر کیا۔ بیسویں صدی کا انسان امن و امان سے جو زندگی بسر کر رہا تھا جب وہ اکیسویں صدی میں داخل ہوا تو تاریخ کے اس اہم موڑ پر یہ واقعہ رونما

ہوا جس نے پوری دنیا پر ہمہ گیر اثرات مرتب کیے۔ اس لئے امن و امان کی اس خراب صورتحال کا سب سے بڑا سبب دراصل یہی سانحہ جانکاہ ہے جو رونما تو امریکہ میں ہوا لیکن اس نے افغانستان، عراق اور پاکستان کو بالخصوص اور پوری دنیا کو بالعموم متاثر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے لکھاریوں کے ہاں اس عہد کا گہرا شعور موجود ہے کہ ان کے عہد کا انسان محفوظ نہیں ہے۔

ii۔ خوف اور بے چینی کی عکاسی:

معاصر انسان کی زندگی کے اندر سکون مفقود ہے۔ اس کے اسباب تو بہت سے ہیں۔ جوں جوں سائنسی ایجادات آگے کی طرف بڑھی ہیں اس کے ساتھ ساتھ انسان کو آسائش بھی حاصل ہو چکی ہے لیکن تخریب کار اذہان نے ان ایجادات سے منفی فائدہ اٹھا کر معاصر انسان کی زندگی اجیرن بنا دی ہے۔ انسان کے آس پاس جب اس قدر خون بہہ رہا ہو، گردنیں کاٹی جا رہی ہوں، انسانی اعضاء کی اس قدر بے حرمتی ہو تو انسان کے اندر خوف اور بے چینی نے جنم لینا ہی ہے۔ ادیب بھی اسی معاشرے کا فرد ہے بقیہ لوگوں کے مقابلے میں وہ زیادہ حساس ہے اور دوسروں سے زیادہ بصیرت بھی رکھتا ہے۔ جو ادیب لالہ و گل سے کلام پیدا کر سکتا ہے وہ اپنے عہد کی زندگی کے نہاں پہلوؤں سے کیونکر آگاہ نہیں ہو سکتا ہے۔ اس طرح آئندہ آنے والے صفحات سے یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ نائن الیون کے بعد انسانی خون کی ارزانی نے جس طرح آج کے انسان کو خوف اور بے چینی کی اذیت میں مبتلا کیا ہے اس کا اثر معاصر افسانہ نگار کے ہاں بھی ہے۔ اس اثر کو لکھاری نے اپنی تحریروں میں بیان کیا ہے۔ اس بات کو ہم صرف افسانے ہی پر نہیں بلکہ پورے ادب پر منطق کر کے دیکھ سکتے ہیں۔ اس بارے میں تاج الدین تاجور رقم کرتے ہیں۔:

> "بم دھماکوں کے نتیجے میں زندگی جس بے قدری اور ناقدری کا شکار ہے۔ بہتے لہو کی ارزانی نے جس طرح ناامیدی کی کیفیت پیدا کر دی ہے، بے ثباتی اور یاسیت کے عالم نے گویا خوابوں اور ارمانوں تک کو بے معنی کر دیا ہے۔"(۳۵)

اب کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے تو یہی صورتحال بھی سامنے آجاتی ہے جس کی عکاسی مندرجہ بالا اقتباس میں کی گئی ہے۔ کوئی بھی دھماکہ رونما ہونے کے بعد عجیب طرح کی بے چینی اور بوکھلاہٹ جنم لیتی ہے۔ پہلے

بہت افراتفری ہوتی ہے کسی کو کسی کی نہیں سوجھتی صرف اپنی جان کی فکر ہوتی ہے۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد اس دہشت زدہ علاقے میں سنسانی چھا جاتی ہے۔ اس قدر تنہائی اور خوف منہ کھولے جب انسان کا انتظار کر رہے ہوں تو لازماً وہ اپنے اگلے دنوں کے بارے میں مایوس اور پریشان تو ہو ہی گا۔ اس کیفیت کو افسانہ نگار نے خوب نبھایا ہے۔

اب کوئی بھی علاقہ ہمیں محفوظ نظر نہیں آتا بلکہ انتہائی حفاظتی حصار میں بھی رہنے والے خطرہ محسوس کرتے ہوئے پریشان ہو جاتے ہیں۔ اس کی عکاسی عرفان عرفی کے افسانے 'فریم سے باہر' میں نظر آتی ہے:

> "آخر کیا چاہتے ہیں وہ؟ کیوں دشمن ہوئے پڑے ہیں، اپنے لوگوں کے؟ مہمان کے پوائنٹ آف ویو سے آنٹی کا سہما ہوا بگ کلوزاپ اندر کی بے یقینی اور خوف کو عیاں نہیں کر پایا۔۔۔ حالانکہ جن ساحلی علاقے کی محفوظ عسکری سکیم میں تم رہتی ہو آنٹی! یہاں تو دہشت گردی کی صرف خبریں ہی پہنچ سکتی ہیں۔"(۳۷)

مندرجہ بالا اقتباس میں ہمارے عہد کے خوف اور بے چینی کو واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح ہر انسان چاہے وہ دہشت گردی کی زد میں براہ راست نہ بھی ہو لیکن ملک میں امن و امان کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر اس کا پریشان ہو جانا عین تقاضہ فطرت ہے۔ حتیٰ کہ جو لوگ محفوظ مقامات پر بھی رہتے ہیں وہ بھی اس صورتحال میں اپنے آپ کو غیر محفوظ تصور کرتے ہیں۔ سائنسی ایجادات نے مثبت نتائج کے ساتھ ساتھ آج کی زندگی پر منفی اثرات مرتب کئے ہیں۔ اسلحے کی دوڑ نے ایک نئی اور خطرناک صورتحال کو جنم دیا ہے۔ معاصر عہد میں صنعتی ترقی نے جہاں سرمایہ داری کو ترقی دی ہے وہاں پر کچھ اقدار کو بھی معاشرے سے نابود کر دیا ہے۔ خطرات اس قدر بڑھ چکے ہیں کہ انسان کی بیش قیمت جان کو چیونٹی سے بھی کمتر سمجھا جاتا ہے۔ انسانوں کا انسان کے گلے کاٹنا عام ہو چکا ہے۔ جوں جوں ہم اکیسویں صدی میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ مادیت پرستی زوروں پر ہے۔ نائن الیون نے جہاں امریکہ کو دوسرے ممالک پر حملے کرنے کا بہانہ فراہم کیا وہاں ہی اسلحے کے پھیلاؤ میں بھی اضافہ کیا۔ معاصر انسان موت کے خوفناک سائے تک اپنی زندگی انتہائی پریشانی اور بے چینی کے عالم میں گزار رہا ہے۔ انسان کی زندگی تو ویسے بھی ناپائیدار تھی لیکن اب عالمی طاقتوں

کی اسلحے کی دوڑ نے اس کو اور زیادہ بے اعتبار کر دیا ہے کیا خبر زندگی کی یہ ڈور کب، کس کے ہاتھوں کٹ جائے۔ اس قلق نے معاصر انسان کو خوف اور بے چینی میں مبتلا کر دیا ہے۔ فرد کی اس کیفیت کے متعلق صبا اکرام رقم طراز ہیں۔

> "دراصل سائنسی ایجادات اور صنعتی ترقی کے عروج نے جہاں ایک طرف اس عہد کے انسانوں کے لئے بے شمار مواقع اور سہولتیں مہیا کی ہیں وہیں دوسری طرف خطرات اور دوسری طرف ان گنت چمکتی تلواریں بھی اس کے سر پر لٹکا دی ہیں اور اب صورتحال یہ ہے کہ کچے دھاگوں سے بندھی ان تلواروں کے نیچے اس عہد کا انسان سانس بھی ڈر ڈر کر لے رہا ہے۔"(۳۸)

معاصر انسان کی زندگی کے المیے کو متذکرہ بالا اقتباس میں واضح اور واشگاف الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ تلواروں کے سائے میں، بم کی آوازوں میں، بارود کی بدبو میں اور حادثات کے خوف میں آج کا انسان زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس کا شعور اردو ادب کے لکھاری کے ہاں بڑا گہرا اور شوخ دکھائی دیتا ہے۔ آج کا انسان جب گھر سے باہر نکلتا ہے تو اسے اپنی زندگی کا بھروسہ نہیں ہوتا جب وہ گھر سے باہر جاتا ہے بچوں کی ماؤں، بھائیوں کی بہنوں اور خاوندوں کی بیویوں کو ایک ہی فکر دامن گیر ہوتی ہے کہ خیریت سے واپسی ہو گی یا نہیں؟ اس کیفیت کا اظہار حنیف باوا نے اپنے افسانے 'آس کی لرزتی لو' میں کیا ہے۔

> "میں سوچنے لگا جب موبائل فون کی سہولت نہیں تھی تب اتنا خطرناک ماحول نہیں تھا۔ ہر جگہ امن تھا، سکون تھا۔ اب ان دہشت گردوں نے فضا کو غیر یقینی بنا دیا ہے۔ ایس ایم ایس کر بھی دو تو گھر والے پریشان ہوتے ہیں۔"(۳۹)

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خوف اور بے چینی کا یہ انداز آج کے تمام لوگوں کے ہاں موجود ہے۔ وہ جب گھر سے باہر جاتے ہیں تو واپس آنے میں اگر ذرا بھی دیر ہو جائے تو گھر والوں کو طرح طرح کے گمان گھیر لیتے ہیں۔

معاصر عہد میں چھڑ جانے والی خطرناک جنگوں نے انسان کے لئے بہت سے مسائل کھڑے کر دیئے

ہیں۔ بے شمار انسانی جانیں سانحات میں ضائع ہو جاتی ہیں۔ موت آج ہر طرف رقص کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان حادثات اور سانحات کے علاوہ بھی صوبائی تعصب، فرقہ واریت اور سیاسی اختلافات کو ہوا دے کر بڑے بڑے جھگڑوں کا جنم لینا اور پھر ان میں انسانی خون کی قربانیاں اب روز مرہ کا معمول بن چکا ہے۔ پہلے زمانے میں کہا جاتا تھا کہ ریاست جان و مال کو تحفظ دے گی لیکن آج انسان کی جان کسی جگہ محفوظ نظر نہیں آتی۔ عدم تحفظ کا شدید احساس انسان کو مسلسل کرب اور بے چینی میں مبتلا کئے رہتا ہے۔ جرائم کی کثرت نے بھی انسان کو پریشان کر دیا ہے۔ آئے روز رونما ہونے والے جرائم نئی سے نئی اور پیچیدہ شکل اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ فرد داخلی طور پر بھی تنہائی کا شکار ہے اور خارجی طور پر بھی بدامنی کی فضا موجود ہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ معاصر انسان داخلی و خارجی دونوں سطحوں پر بے چین ہے۔ ایک خوف ہر وقت انسان کو گھیرے رہتا ہے۔ سلیم آغا قزلباش نے اس کی عکاسی ان الفاظ میں کی ہے:

> "آج کے دور میں چھڑ جانے والی جنگیں فرد کے لئے انتہائی جان لیوا بن چکی ہیں۔ اس طرح نسلی اور فرقہ وارانہ فسادات کے خوف نے جان و مال کے بارے میں عدم تحفظ میں مبتلا کر دیا ہے بالخصوص بڑھتے ہوئے جرائم نے اس کا سکھ چین حرام کر دیا ہے۔ دن کو باہر نکلتے ہوئے بھی وہ ایک نادیدہ خوف کے گھیرے میں ہوتا ہے اور رات کو مقفل مکان میں مقید ہو کر بھی اس کو چین سے نیند نہیں آتی۔"(۴۰)

امن و امان کی اس صورتحال نے ہر جگہ بے چینی اور بے سکونی کے ماحول کو جنم دیا ہے۔ اب اس دہشت گردی سے نجات حاصل کرنے کے لئے طرح طرح کے آپریشن بھی کئے گئے۔ اپنے ملک میں اپنے ہی باشندوں کو مہاجر بننا پڑا۔ وزیرستان کے حالات زیادہ ابتر، ناگفتہ بہ ہو گئے۔ اس کے متعلق بھی افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں تذکرہ کیا ہے۔ وزیرستان میں آپریشن کے بعد پیدا ہونے والے خوف اور بے چینی کو رشید مصباح نے اپنے افسانے 'خاک زادے' میں بیان کیا ہے۔ انسان کے خون کو اس طرح بہایا جاتا ہے کہ اس کی ناقدری دیکھ کر ہوش والے اور عقل والے بھی ششدر رہ جاتے ہیں۔ انسان کے مقدس خون کی ارزانی تمام انسانوں اور ملکوں کے لئے لمحہ فکریہ ہے۔ اموات کی کثرت نے فرد کو داخلی طور پر ٹوٹ پھوٹ کا شکار کر دیا ہے اور انسان پریشان ہو گیا ہے۔ اس کی عکاسی ملاحظہ ہو:

"علی شیر پریشان ہو کر اٹھ کے چارپائی پر بیٹھ گیا اور اس کے ذہن میں ان دیکھے مناظر ابھرنے لگے۔ وزیرستان کے کسی علاقے میں گولے برس رہے ہوں گے اور کئی مکان ملبے کا ڈھیر بننے کے ساتھ ساتھ آگ کی لپیٹ میں آ چکے ہوں گے اور لازماً بہت انسان لقمہ اجل بن گئے ہوں گے۔"(۴۱)

۹/۱۱ کے بعد امریکہ نے افغانستان پر حملہ کیا اس کے بعد پاکستان کی مغربی سرحد محفوظ نہیں ہے۔ آئے روز کسی نہ کسی طرح سے وہاں خون کی ہولی کھیلی جاتی ہے۔ کبھی ڈرون حملوں کی صورت میں اور کبھی طیاروں کے ذریعے بمباری کی جاتی ہے۔ کبھی آپریشن کر کے دہشت گردوں کا صفایا کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔ اس سارے عمل میں جو سب سے زیادہ متاثر ہوتا ہے وہ عام انسان ہے۔ اس نے صدیوں کی محنت سے جو گھر تعمیر کئے ہوتے ہیں دھڑم سے کسی بم کا نشانہ بن کر اڑ جاتے ہیں۔ رقص کرتی ہوئی موت اور عام انسان کا خون اس قدر بہایا جا رہا ہے کہ آج کے افسانہ نگار کا قلم بھی خونچکاں ہے جس کا اندازہ مندرجہ بالا اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے۔

انور زاہدی بھی ایک باشعور افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں میں بھی اپنے عہد کا گہرا شعور ہے۔ اس طرح وہ اپنے عصر کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر لکھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے متعلق ڈاکٹر شفیق انجم کی رائے ملاحظہ ہو۔

"انور زاہدی کے موضوعات کا خصوصی حوالہ جدید انسان کو درپیش مسائل ہیں۔ ذات کا بکھراؤ، عدم شناخت، انتشار اور کرب کی کیفیات کو انہوں نے بھرپور تاثر کے ساتھ منقش کیا ہے۔"(۴۲)

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ آج کے افسانہ نگار کے ہاں اپنے عصر کا گہرا شعور ہے۔ امن و امان کی صورتحال ہو، بے چینی کی فضاء ہو۔ فرد کے داخلی مسائل ہوں یا خارجی مسائل ہوں۔ ان تمام موضوعات کو آج کے افسانہ نگار نے کسی نہ کسی طرح استعمال کیا ہے۔ آج کے افسانے کو ہم ہمہ گیر کہہ سکتے ہیں جس میں موضوعات کی کثرت ہے۔ ترقی پسند افسانہ انسانی زندگی کی صرف ایک جہت کو لے کر چلتا ہے لیکن آج کا

افسانہ انسانی زندگی کی طرح رنگارنگ ہے اور تمام موضوعات کا احاطہ کیے ہوئے نظر آتا ہے۔

iii۔ مغربی ممالک کے عزائم کے اشارات:

اگر ماضی میں جھانکا جایا تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ مختلف ممالک نے اپنے وسائل کے باوجود بھی کسی دوسرے علاقے کے لوگوں کو اپنا مطیع بنانے کے لئے تمام ذرائع استعمال کئے۔ تمام ترقی یافتہ ممالک کی یہ کوشش رہی کہ کمزور ممالک میں پائے جانے والے ذرائع دولت پر قبضہ کر کے ان کو تصرف میں لایا جائے۔ یہ روش خاص طور پر برطانیہ اور فرانس کے ساتھ مخصوص سمجھی جاتی ہے جس نے اپنے ممالک کے علاوہ مختلف ممالک پر قبضہ کر کے وہاں نئی آبادیاں قائم کیں۔ اگر ہندوستان کی بات کی جائے تو یہاں پر سولہویں صدی سے انگریزوں کی نظریں جم چکی تھیں اور بعد کے ادوار میں انہوں نے یہاں پر قبضہ کر کے ہندوستان کی دولت کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا۔ یہی وجہ ہے کہ باشعور قلم کاروں نے ہمیشہ ان کی مخالفت کی تھی جس میں اکبر الٰہ آبادی سرفہرست ہیں۔ آج امریکہ بھی اسی روش پر گامزن ہے۔ تاج الدین تاجور کی رائے سے اتفاق کئے بغیر چارہ نہیں ہے:

> "امریکہ اگر اپنی بے پناہ معیشت پر قانع رہتا اور بحیرہ خزر (Caspian Sea) کے تیل و گیس اور وسط ایشیاء کے دوسرے وسائل کو للچائی ہوئی نظروں سے نہ دیکھتا اور اپنی حربی طاقت کے گھمنڈ کے نشے سے سرشار نہ ہوتا تو شاید کیا یقیناً وہ نئی عالمی ترتیب کی بات نہ کرتا۔ اس کے مختلف ادارے مستقبل قریب کے نئے نئے نقشے نہ تراشتے اور مختلف ممالک کے حصے بخرے کرنے کی باتیں نہ ہوتیں۔"(۴۳)

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ امریکہ کے عزائم اس خطے میں مخصوص مقاصد کے لئے ہیں۔ امریکہ دراصل اپنے کچھ مفادات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ عراق پر حملہ دراصل اس کے تیل کے کنویں خشک کرنے کے لئے کیا گیا تھا۔ افغانستان پر حملہ بھی ایسے ہی کسی مقصد کا نتیجہ ہے۔ دنیا میں اسلحے کی تمام تر دوڑ امریکہ ہی کی وجہ سے ہے۔ امریکہ خود اپنے آپ کو مزید طاقتور بنا رہا ہے جبکہ دوسرے ممالک اگر اسلحے کا استعمال کریں تو ان پر طرح طرح کی پابندیاں لگوانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ

امریکہ پوری دنیا کا چوہدری بننا چاہتا ہے۔ تمام دنیا کے وسائل پر قبضہ کرنے کے لئے نائن الیون کا ڈرامہ رچایا گیا ہے۔ امریکہ کی افغانستان میں مداخلت کا ذکر آغا گل کے افسانے 'مس کنڈکٹ' میں موجود ہے۔ ملاحظہ ہو:

> "کہتے ہیں مصیبت اکیلی نہیں آتی، افغانستان میں روس کے خلاف کود پڑا تھا۔ اسے کولڈ وار اچھی نہ لگی، پاکستان کے ذریعے اس نے پراکسی وار شروع کر دی۔ جس نے پاکستانی قوم کو Mass Hysteria میں مبتلا کر کے مذہب کے نام پر طویل جنگ میں دھکیل دیا۔ حالانکہ یہ کمیونزم اور کیپٹل ازم کی جنگ تھی۔"(۴۴)

اس افسانے میں واضح طور پر امریکہ کے مذموم عزائم کا ذکر موجود ہے۔ دراصل امریکہ اور روس کی باہمی آویزش سرمایہ دارانہ نظام اور کمیونزم کے درمیان جاری کشمکش تھی۔ پاکستان کو امریکہ نے اپنے مخصوص مقاصد کے لئے اس وقت تیار کیا۔ یہاں پر جہادی تیار کئے گئے اور سویت یونین کے تابوت میں آخری کیل افغانستان میں ٹھونک دی گئی اور یہ ریلا آ کر افغانستان ہی میں زمین بوس ہوا۔ اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے ہ افسانہ نگار کے ہاں اپنے عہد کا گہرا شعور ہے اور تاریخ پر بھی اس کی نظر کڑی ہے۔ امریکہ دراصل اپنے مقابلے میں کسی کو کھڑا نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ طاہرہ اقبال نے درست کہا ہے:

> "جب عالمی وسائل کی بندر بانٹ میں کیپٹل ازم کی گرفت مضبوط تر ہوتی چلی گئی۔ اس لئے سائنس و ٹیکنالوجی کے مسائل اور ارتکاز دولت کے ذرائع پر ایک طاقت غالب آتی چلی گئی اور وہ امریکہ تھا جسے دنیا پر فوقیت، ذرائع پیداوار پر غلبہ اور اپنے مقاصد میں وسعت اور استحکام حاصل ہوتا چلا گیا۔"(۴۵)

دراصل امریکہ نے کمیونزم کو شکست دینے کے لئے بھی پاکستان کا استعمال کیا۔ پھر اس نے نائن الیون کا ڈرامہ رچا کر عالمی وسائل پر قبضہ کرنے کی کوشش کا آغاز کیا۔ انہوں نے سائنسی ترقی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مزید مہلک ہتھیار بناتے ہوئے اپنے آپ کو ناقابل تسخیر بنیا اپھر راتوں رات کسی بھی ملک پر حملہ کر کے وہاں کی دولت پر ہاتھ صاف کرنے کا وتیرہ اپنائے رکھا۔ معاصر افسانہ نگار کے ہاں اس کا گہرا شعور موجود ہے کہ امریکہ بالخصوص اور مغربی ممالک بالعموم جو عزائم رکھتے ہیں ان کے ہاں اس کے اشارے واضح بھی ہیں اور

گہرے بھی ہیں۔

نائن الیون کے بعد مغربی ممالک نے اسلام دشمنی کا پہلے سے زیادہ مظاہرہ کیا ہے۔ مغربی دنیا نے اسلام کو بگاڑ کر پیش کیا ہے۔ اپنے ہاں آنے پر انہوں نے مزید سختیاں لگا دی ہیں جبکہ خود مغربی ممالک کے لوگ پوری دنیا میں آزادی سے پھر رہے ہیں۔ اس کی عکاسی ہمیں انور زاہدی کے افسانے 'پرانے کاغذوں میں' نظر آتی ہے:

> "یہ ساری بندشیں اس لئے لگائی جارہی تھیں کہ اب یورپ، امریکہ اور کینیڈا کے ممالک بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر امیگریشن کی پالیسیوں میں دن بدن سختی کیے جارہے تھے۔ اس کے باوجود ہمارے ہاں برین ڈرین میں کمی کی بجائے دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔"(۴۶)

مغربی ممالک نے یہاں کے لوگوں کو اپنے مفادات کے لئے استعمال کیا ہے۔ آج کے دور ایک اہم ادیب حمید شاہد کے افسانے 'سورگ میں سور' کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ ان کے ایک اور افسانے 'مرگ زار' کا تذکرہ طاہرہ اقبال نے بھی اپنی کتاب میں کیا ہے۔ انہوں نے مغربی ممالک بالخصوص امریکہ کے مقاصد کو بڑے واضح اور واشگاف الفاظ میں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

> "افسانہ تاریخی اعتبار سے اس عہد کی سمت کی طرف اشارہ کرتا ہے جب شہید تیار کرنے کے لئے باہر سے اربوں ڈالر آرہے تھے اور اسلام کے جانثاروں کی تیاری باقاعدہ ایک کاروبار بن چکا تھا۔ اس صنعت کو پھیلانے میں مذہبی پیشوا، فوجی جرنیل اور حکمران سبھی برابر کے حصے دار ہیں۔"(۴۷)

اس طرح افغانستان میں امریکی مفادات تھے وہاں پر انہوں نے کمیونزم کو ڈھیر کرنا تھا اس کیلئے انہوں نے ہماری سرزمین اور ہمارے لوگوں کو استعمال کیا۔ اس حمام میں سب ننگے نظر آتے ہیں۔ ضمیر فروش لوگوں نے پیسے کی خاطر ملک کو ایک طویل اندرونی جنگ میں دھکیل دیا۔ اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ امریکہ نے وطن عزیز پاکستان کو اپنے مفاد کی خاطر استعمال کیا ہے۔ اب جن لوگوں کو امریکہ نے تیار کروایا

اب ان کے ساتھ ہم بر سر پیکار ہیں۔ ہم نے اپنے لوگوں کو بے گھر کیا اور اپنے لوگوں پر بم برسا کر انہیں اذیت دی اور ملک کو بدامنی کا شکار کر دیا۔ اب افسانوں میں ان تمام پہلوؤں کو واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اب قدیم اور جدید کی بحث بھی چل رہی ہے۔ جدت پسند طبقہ جو اپنے آپ کو روشن خیال کہتا ہے وہ طالبان کو قدامت پسند قرار دے رہا ہے جبکہ قدامت پسند جو بھی لوگ ہیں وہ جدت پسندوں کو پسند نہیں کرتے اس مسئلے کا شعور مندرجہ ذیل اقتباس میں کس گہرائی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے: ''نہ نئے کے نام پر جنگ لڑنے والا نیا ہے اور نہ ہی پرانا کے پر میں جنگ باز پرانا ہے۔ سارا مسئلہ وسائل پر قبضے اور لوٹ مار کا ہے۔''(۴۸)

اس اقتباس میں واضح طور پر مغربی ممالک کے ہوس پرستانہ اداروں کو بیان کیا گیا ہے۔ ان میں امریکہ سر فہرست ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ دوسرے تمام ممالک کو اپنی کالونی بنا کر رکھا جائے۔ کبھی دھمکیوں اور کبھی مکھن لگا کر اپنے مفادات کو حاصل کرنے کی کوشش آئے روز میڈیا پر دیکھنے میں نظر آتی ہے۔ آج کا افسانہ نگار اور ادیب ان تمام چالوں سے واقف ہے۔ آج کے افسانہ نگار کی اپنے آس پاس گہری نظر ہے۔ شمارہ نمبر ۱۱۳ میں نیاز محمود کا علامتی افسانہ 'پیوند' اعلیٰ پائے کا افسانہ ہے۔ انہوں نے مغربی ممالک کے مقاصد کی طرف اپنے افسانے میں واضح اشارے کئے ہیں۔ اس میں ایک کردار واحد متکلم ہے دوسرا بچڑ خان ہے۔ متکلم کردار کسی انجانے دیس میں چلا جاتا ہے جہاں کے لوگوں کی ناک، زبان اور ٹانگیں کٹی ہوئی ہیں۔ اب واحد متکلم کردار بچڑ خان سے سوال پوچھا ہے کہ اس ملک کے باشندوں کی ٹانگیں کیوں کاٹ دی گئی ہیں: '' سیدھی سی بات ہے وہ چاہتے تھے کہ اس ملک کے باشندے تا قیامت اپنے پیروں پر نہ کھڑے ہو سکیں اور تمام عمر اپاہج رہیں۔''(۴۹)

یعنی یہ اغیار کی سازش ہے کہ وہ ہمیں کمزور کرنے کی ہر وقت سعی کرتا ہے۔ افسانہ نگار نے کس خوبصورتی سے بات واضح کر دی ہے اور آج صورتحال بھی یہی ہے کہ ہم اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہیں ہم اغیار سے بھیک مانگ رہے ہیں۔ آگے چل کر افسانے کا مرکزی کردار یہ سوال پوچھتا ہے کہ ناک کیوں کٹی ہوئی ہے؟ ایسا ہے بچڑ خان بولے ''اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ غیر آباد (علاقے کا نام) کا کوئی بھی نوجوان لڑکا یا لڑکی کبھی بھی ان کے سامنے سر اٹھا کر نہ چل سکے اور ہمیشہ کے لئے دبا دبا سا اور شرمندہ رہے۔''(۵۰)

اس بات میں شک نہیں ہے کہ مغربی تہذیب کے نام پر آج کا نوجوان جو کر رہا ہے وہ بھی مغربی

ممالک کی سازش ہے۔ وہ دراصل نوجوان کو اپنا ہم خیال بنانا چاہتا ہے۔ دراصل یہ سب مشرق میں اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے کیا جارہا ہے۔ دوسری طرف اسلام کے خلاف مغربی ممالک کا جو پروپیگنڈہ ہے وہ بھی مختلف صورتوں میں سامنے آرہا ہے۔ ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ اپنی مادیت پرستانہ تعلیمی نظام بھی یہاں پر نافذ کررہے ہیں ان کا مقصد صرف اپنی تہذیب کو غلبہ عطا کرنا ہے۔ جو کام وہ طاقت سے نہیں کرسکتے ایسے میں وہ تہذیبی ہتھیار کو استعمال کرتے ہیں۔ متذکرہ بالا افسانے کے مرکزی کردار سے جب یہ پوچھا گیا کہ بچوں کی زبان کیوں کاٹ دی جاتی ہے؟ اس کے جواب میں بچڑخان بولا: "سرخ اینٹوں کی وہ عمارت سکول ہے اور یہ وہ جگہ ہے جہاں ہمارے بچوں کی مادری زبان چھین کر پرائی زبان کی پیوند کاری کی جارہی ہے۔"(۵۱)

اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ ہم انگریزی تعلیم میں زیادہ گھس کر اخلاقی اقدار کو فراموش کرچکے ہیں جو ہماری تہذیب کا خاصا تھا۔ ہم اپنی زبان کو بھی حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہی دراصل ان ممالک کی سازشیں ہیں جو کام وہ براہ راست نہیں کرسکتے تو کبھی نائن الیون جیسا ڈرامہ رچایا جاتا ہے اور کبھی اپنی تہذیب کا ظاہری طور پر چکاچوند اور باطنی طور پر کھوکھلا چہرہ دکھا کر اپنے مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر ریاض مجید نے بھی لکھا ہے:

> "بین الاقوامی سطح پر بڑے ممالک کی تحقیق شدہ ناانصافی، انسانی قدروں اور معاشرتی عدل وانصاف کو پامال کررہی ہے۔ ڈرون حملے، بمباری، قتل وغارت۔۔۔۔۔۔ناخواندہ مملکتوں میں قیادت کی خریداری، اسی سلسلہ شر کے شاخسانے ہیں۔"(۵۲)

اس بحث سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغربی ممالک اپنے مخصوص مقاصد کے حصول کیلئے مشرقی ممالک میں جو کچھ کررہے ہیں اگرچہ آج کا حکمران اس سے بے خبر ہے لیکن آج کا لکھاری اس کا گہرا شعور رکھتا ہے۔ افسانہ نگاروں نے معاصر عہد کی روح کو پوری طرح محسوس کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ ان ممالک کے مقاصد کیا ہیں۔ مغربی ممالک کو اس بات سے کوئی بھی لینا دینا نہیں ہے کہ دوسروں کا کیا نقصان ہے۔ انہیں صرف اپنے مقاصد عزیز ہیں۔ اس بات کو افسانہ نگار نے اپنی تخلیقات میں پیش کرکے دروں بین ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

iv۔ معمولات زندگی میں تبدیلی کی عکاسی:

نائن الیون کے بعد کی دنیا بیسویں صدی سے مختلف ہے، جب نئی صدی کے آغاز کے ساتھ ہی نائن الیون کا واقعہ رونما ہوا تو بدلے ہوئے حالات نے انسانی زندگی پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ پہلے ذکر ہو چکا کہ معاصر انسان اندرونی اور بیرونی دونوں سطحوں پر بے چینی اور انتشار کا شکار ہے۔ اب ۱۱ ستمبر کو امریکہ میں رونما ہونے والے واقعہ نے پاکستان پر بالخصوص اثر ڈالا یہاں کے لوگوں کے معمولات یکسر تبدیل ہو گئے۔ اس کا احساس معاصر افسانہ نگار کو بھی ہے۔ اب صورتحال پوری طرح بدل چکی ہے زندگی جس قدر تیزی ہوئی ہے اس پر پابندیاں اتنی ہی لگائی جا رہی ہیں۔ آج فرد کی چھوٹی چھوٹی حرکات پر نظر رکھی جاتی ہے۔ اگر کوئی ملزم نہ بھی ہو غلطی سرزد نہ ہو پھر بھی شک کی بنیاد پر موت کے گہرے کنویں میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ فرد آج بہت پابند ہو چکا ہے۔ دفاعی پالیسیوں نے اور عسکری منصوبہ بندیوں نے آج کے انسان کو پوری طرح جکڑ دیا ہے۔ یہ تمام معاملات نائن الیون کے بعد رونما ہوئے ہیں۔ اس کے متعلق ڈاکٹر نجیبہ عارف رقم طراز ہیں:

> ”زندگی کی تمام تر فعالیت معاشی، عسکری اور سیاسی منصوبہ بندیوں سے متاثر ہو رہی ہے۔ بجلی کی لوڈشیڈنگ سے لے کر سڑکوں پر جگہ جگہ لگائے گئے ناکوں تک، رکاوٹ اور بند باندھنے کا احساس زندگی کی ہر حرکت اور سمت کو متاثر کر رہا ہے، پاکستان میں انتشار اور زوال کا یہ عمل ہر ذہن کو سوچنے پر مجبور کر رہا ہے۔“(۵۳)

یہ بات واضح ہے کہ آج نقل و حرکت پر بہت زیادہ پابندیاں ہیں۔ انسان کی نجی زندگی بحران کا شکار ہے۔ حفاظتی اقدامات کے نام پر ہر فرد کی جگہ جگہ تلاشی لی جاتی ہے۔ اس کی نجی زندگی میں دخل اندازی اب معمول بن چکا ہے۔ کچھ سال پہلے تک فرد کی زندگی اس قدر پابند سلاسل نہ تھی۔ یہ حالات زیادہ تر اکیسویں صدی کی پیداوار ہیں۔ بدقسمتی یہ کہ نئی صدی کے آغاز پر ہی ایک سانحہ رونما ہوا جس نے آئندہ زندگی کے معمولات میں مکمل طور پر معمولات زندگی کی تبدیلی کا راستہ ہموار کیا۔ اس حوالے سے خالدہ حسین کا افسانہ 'پائیڈ پائپر' جو شمارہ اٹھانے میں شائع ہوا ہے خاصے کی چیز ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ”بچے مسلسل ٹی وی چینلز بلند رہے تھے۔۔۔ سڑکوں پر خار دار باڑیں کھڑی کی جا رہی

تھیں اور پولیس کی جیپیں اور فوجی ٹرک خالی بالکل خالی صاف ستھری سڑکوں پر سست رفتاری سے رواں تھے۔ چمکتی دمکتی دکانیں، تجارتی مراکز، دفتر سب کچھ بند، کچھ پر لوہے کے شٹر پڑے ہوئے تھے۔ کچھ کے محض دروازے مقفل تھے۔"(۵۴)

مندرجہ بالا اقتباس میں ہماری زندگی کی مکمل اور جامع تصویر کشی کی گئی ہے۔ خالدہ حسین ہمارے عہد کی ایک معتبر تخلیق کار تھیں۔ انہوں نے اعلیٰ پائے کے افسانے تخلیق کئے۔ ان کا متذکرہ بالا افسانہ ہمارے عہد کے حالات کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ کس طرح آج امن و امان کے پیش نظر یکدم دکانیں بند، دفاتر میں چھٹی اور سڑکیں سنسان ہو جاتی ہیں۔ نائن الیون کے بعد دہشت گردی کا جن بوتل سے باہر آ گیا، اس کو دبانے کی کوشش منفی انداز سے کی گئی اور جس نے آج فرد کی زندگی کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ معمولات زندگی میں اس قدر تبدیلی آ گئی ہے کہ انسان جو محفلوں کا عادی تھا اب محفل میں جانا اسے پُر خطر محسوس ہوتا ہے کیونکہ شدت پسند عناصر تاک میں ہوتے ہیں اور ان کی نظریں ایسی جگہوں پر ہوتی ہیں جہاں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو نقصان پہنچایا جا سکے۔

ہمارے ملک میں تو فرد کے معمولات میں تبدیلی آئی ہے لیکن اس سے زیادہ تبدیلی ان لوگوں کی زندگی میں آئی ہے جو امریکہ اور دیگر مغربی ممالک میں قیام پذیر ہیں۔ وہ لوگ جو دیار غیر کو اپنا وطن سمجھے ہوئے تھے نائن الیون کے بعد ان کی زندگی میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ اب وہاں پر ان کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو ان کی جان پر بن جاتی ہے۔ اس کا تذکرہ پہلے بھی مسعود مفتی کے افسانے 'شناخت' کے حوالے سے ہو چکا ہے۔ اس کے متعلق نوشین توقیر نے استفہامیہ انداز میں ہمیں سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔

"یوں اردو فکشن میں بڑی حد تک گیارہ ستمبر کے واقعے کا پہلا ردعمل امریکی مسلمانوں پر ہوا ہے حالانکہ وہ برس ہا برس سے امریکی شہری تھے ان کے دل میں بھی دہشت گردی اور اس کا ساتھ دینے والوں کے لئے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ انہوں نے بھی اپنی شناخت کو امریکی شناخت میں ضم کر لیا تھا پھر وہ ایک دم پردیسی کیوں ہو گئے۔"(۵۵)

اس طرح نائن الیون ایک جھٹکا تھا جس نے فوراً امریکہ میں مقیم مسلمانوں کی آنکھیں کھول دیں۔ انہوں نے امریکہ ہی کو اپنا وطن بنالیا تھا لیکن انہیں کیا خبر تھی کہ ایک وقت عنقریب ایسا آنے والا ہے جب یہاں پر ان سے غیروں والا سلوک شروع ہو جائے گا۔ نائن الیون کے بعد ایسا ہی ہوا۔ اس تبدیلی اور بدلاؤ کو اردو افسانے نے اپنے دامن میں سمونے کی خوبصورت کوشش کی ہے۔ عرفان عرفی کا افسانہ 'فریم سے باہر' جو کہ ہمیں واضح طور پر نائن الیون کے اثرات لے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ اب قوم کے اندر جذبات کو ابھار کر کسی معمولی سے مسئلے کو شدت پسندانہ رنگ دے دیا جاتا ہے۔ پر امن احتجاج ہی ہو اس و بھی پر امن نہیں رہنے دیا جاتا بلکہ اس میں جلد ہی تشدد کی رنگ آمیزی شامل ہو جاتی ہے۔ اب اس اقتباس کو دیکھیے:

> "عوام میں غم اور غصے کی لہر ہے، ہر چہرہ ہراساں اور مشتعل۔۔۔۔۔ سکیورٹی کی صورتحال انتہائی نازک۔ رائٹر کو قدم قدم پر اہلکاروں کو بتانا پڑ رہا ہے کہ وہ ڈرامہ نگار ہے، اسے جانے دیا جائے۔ ایک دو پولیس ناکے ایسے بھی ہیں جہاں اس کی جیب میں پائے گئے سرخ بال پوائنٹ کو شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ میٹل ڈیٹیکٹروں سے اس کی خوب جانچ پڑتال کی جاتی ہے۔"(۵۶)

واضح طور پر متذکرہ بالا اقتباس میں معاصر انسان کی زندگی پر جو قدغنیں لگ چکی ہیں سامنے نظر آ رہی ہیں۔ فرد کی نجی زندگی نہ ہونے کے برابر ہے۔ حفاظت کے نام پر اس کی ہر جگہ تلاشی معمول بن چکا ہے۔ پولیس بے گناہ لوگوں کو بھی شک کی نظر سے دیکھتی ہے۔ بعض اوقات یہ شک کسی بڑے حادثے کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔ روزمرہ کی عام اور معمولی چیزیں رکھنے پر شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اب موجودہ دور میں واقعات جو رونما ہوتے ہیں ان کے اثرات بہت تیز اور فوری ہوتے ہیں۔ اب نائن الیون کے بعد جنگ کے تصور میں بھی تبدیلی آگئی ہے۔ اب جنگ تلواروں، گھوڑوں اور تیر کمانوں کی بجائے لیبارٹریوں میں لڑی جاتی ہے۔ سائنسی ترقی نے انسان کو تباہی کے مزید قریب کر دیا ہے۔ اپنے آپ کو مزید طاقتور بنانے کے چکر میں امریکہ ہتھیاروں کی دوڑ میں سب سے آگے ہے۔ صبا اکرام نے درست فرمایا ہے: اس عہد میں جنگ کا تصور یکسر بدل چکا ہے کیونکہ اسلحے بدل گئے ہیں۔ اب جنگوں میں تلواریں نہیں چلتیں بلکہ گولیاں چلتی ہیں اور بم گرائے جاتے ہیں۔(۵۷)

اکیسویں صدی بہت سی تبدیلیوں کی صدی ہے۔ انسان اس تیزی سے سائنس میں ترقی کر رہا ہے کہ گزرا ہوا کل اسے قدامت پسند دور نظر آتا ہے۔ ان تبدیلیوں میں نائن الیون کا کردار بھی واضح طور پر موجود ہے۔

زیف سید کا ایک افسانہ 'حکیم صاحب' دراصل زندگی کی بدلتی ہوئی جہات کی نشاندہی کرتا ہے۔ عدم برداشت کی بھرپور عکاسی کرتا ہوا یہ افسانہ شمارہ ۱۰۵ کے نمائندہ افسانوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ ایک بستی میں مدرسے تعمیر ہو رہے ہوتے ہیں۔ پہلے ایک فرقے کا مدرسہ بنتا ہے، بعد میں دوسرے کا مدرسہ بنتا ہے۔ اس طرح سلسلہ چل نکلتا ہے۔ پھر فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو جاتے ہیں۔ جن کی وجہ سے شریف لوگوں کی زندگی اجیرن بن جاتی ہے۔ یہ دراصل اغیار کی سازشیں ہی ہیں کہ آج ہم ایک دوسرے کو برداشت نہیں کر سکتے۔ ہمارے دلوں میں بغض ہے اور ہم اپنے علاوہ کسی دوسرے کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہی نہیں ہیں۔ پھر اغیار کو موقع ملتا ہے تو یہ صورتحال جنم لیتی ہے:

> "جونہی یہ پارٹی الفاروق کے آگے سے گزرنے لگی تو مدرسے کا پھاٹک اچانک چرچراتا ہوا کھلا، ڈنڈوں اور لاٹھیوں سے لیس طلبہ نے نعرہ تکبیر بلند کر کے مریدوں پر اندھا دھند لاٹھیاں برسانا شروع کر دیں۔۔۔ ایک ڈنڈا پیر صاحب کو بھی لگا، بیہوش ہو گئے۔ دارالعلوم چشتیہ کے طلبہ کو پتہ چلا تو وہ بھی جو چیز ہاتھ میں آئی لئے دوڑے دوڑے آئے اور بازار میں گھمسان کا رن شروع۔"(۵۸)

اغیار نے اپنے مفادات حاصل کرنے کے لئے انہی مدرسوں کو استعمال کیا اور مندرجہ بالا صورتحال نے جنم لیا ہے۔ اس قدر شدت پسندی میں کسی کی جان و مال، عزت و آبرو محفوظ نہیں رہتی۔ اس قدر جذباتی انداز سے انسان میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کا بالکل خاتمہ ہو جاتا ہے۔

گزشتہ صفحات پر افسانوں کی مثالوں اور ناقدین کی آراء سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ۹/۱۱ کے بعد ایک نئی زندگی کا آغاز ہوا ہے جو بیسویں صدی کی زندگی سے قطعی مختلف ہے۔ آج کا فرد عدم تحفظ کا شکار ہے اس کی نجی زندگی بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے حفاظت کے نام پر اس کی جائز نقل و حرکت میں بھی رکاوٹ پیدا کرنے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ اس کا گہرا شعور آج کے افسانہ نگار کو ہے۔ آج کے تخلیق کار نے اس کرب کو

شدت سے محسوس کیا ہے اور اسے اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔ ان افسانوں کے مطالعے کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ ان میں اپنی عصر کی جامع و مکمل تصویر ابھر کر سامنے آئی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ۱۱/۹ دہائی کے اہم واقعات، تصاویر میں (کالم) www.bbc.com/urdu، ۷ جنوری ۲۰۱۹ء، 2:30pm

۲ اعجاز خان، پروفیسر An Introduction 11/9، (مضمون) مشمولہ، پاکستانی زبان و ادب پر ۱۱/۹ کے اثرات، مرتبہ: ادارہ ادبیات اردو، جامعہ پشاور وہائر ایجوکیشن کمیشن پشاور، ۲۰۱۰ء، ص ۲۵۸

۳۔ پورچیسٹا، The top 10 novel about 9/11، www.theguardian.com، ۷ فروری ۲۰۱۹ء، 3:50pm

۴۔ الطاف یوسفزئی، ڈاکٹر فہمیدہ گل درانی (مرتبین) اردو نظم اور ۱۱/۹، شعبہ اردو، ہزارہ یونیورسٹی، مانسہرہ، ۱۱ ستمبر ۲۰۱۲ء، ص ۸

۵۔ اعجاز خان، پروفیسر An Introduction 11/9، (مضمون) مشمولہ، پاکستانی زبان و ادب پر نائن الیون کے اثرات، ص ۲۵۷

۶۔ رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی ادب اور رجحانات، پورب اکادمی اسلام آباد، طبع اول، ۲۰۱۰ء، ص ۷۱

۷۔ رشید امجد، ڈاکٹر، جدید ادبی تناظر، الفتح پبلی کیشنز راولپنڈی، ۲۰۱۲ء، ص ۶۸

۸۔ مسعود مفتی، شناخت (افسانہ)، مشمولہ 9/11 اور پاکستانی اردو افسانہ، مرتبہ: نجیبہ عارف، بورپ اکادمی، اسلام آباد، بار اول، مئی ۲۰۱۱ء، ص ۸۷

۹۔ افتخار نسیم، پردیسی (افسانہ)، مشمولہ: 9/11 اور پاکستانی اردو افسانہ، مرتبہ نجیبہ عارف، ص ۱۸۹

۱۰۔ نیلوفر اقبال، آپریشن مائنس (افسانہ) مشمولہ: محولہ بالا، ص ۱۲۳

۱۱۔ علی حیدر ملک، دہشت گرد چھٹی پر، مشمولہ: محوالہ بالا، ص ۲۵۶

۱۲۔ علی حیدر ملک، دہشت گرد چھٹی پر (افسانہ)، مشمولہ: محولہ بالا ص ۲۵۶

۱۳۔ حمید شاہد، سورگ میں سور (افسانہ) مشمولہ: محوالہ بالا، ص ۱۹۰

۱۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، افسانہ اور افسانہ نگار: تنقیدی مطالعہ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۳۲

۱۵۔ رشید امجد، ڈاکٹر، جدید ادبی تناظر، ص ۷۱

۱۶۔ نورالہدی شاہ، سات آسمانوں تلے (افسانہ)، مطبوعہ: سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۹۸، جنوری تا مارچ ۲۰۱۳ء،

اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ص ۶۱

۱۷۔ محولہ بالا

۱۸۔ طاہرہ اقبال، پاکستانی اردو افسانہ، سیاسی و تاریخی تناظر میں، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۶۶۶

۱۹۔ فرخ ندیم، کچھ لکھنے سے پہلے (افسانہ)، مشمولہ: سہ ماہی ادبیات، شمارہ: ۱۰۰،، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۳، ص ۱۴۶

۲۰۔ محولہ بالا

۲۱۔ محولہ بالا

۲۲۔ نجیبہ عارف، (مرتبہ) 9/11 اور پاکستانی اردو افسانہ، ص ۲۶

۲۳۔ فرخ ندیم، کچھ لکھنے سے پہلے (افسانہ)، شمارہ ۱۰۰ ص ۴۲

۲۴۔ عرفان عرفی، فریم سے باہر (افسانہ)، سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۰، ص ۱۲۹

۲۵۔ زبیدہ ذوالفقار، اردو غزل پر 9/11 کے اثرات، (مضمون) مشمولہ: پاکستانی زبان و ادب پر نائن الیون کے اثرات (مجموعہ مقالات)، ص ۲۷

۲۶۔ خالد فتح محمد، اور طرح کی جنگ (افسانہ) مشمولہ: سہ ماہی ادبیات، شمارہ: ۱۰۰، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۳ء، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ص ۱۰۶

۲۷۔ اخلاق احمد، بنجر بے رنگ زندگی والا، (افسانہ)، مشمولہ، سہ ماہی ادبیات، شمارہ: ۱۰۰، ص ۱۰۶

۲۸۔ طاہرہ اقبال، پاکستانی اردو افسانہ سیاسی و تاریخی تناظر میں، ص ۶۶۷

۲۹۔ محولہ بالا

۳۰۔ حامد سراج، کالی دیواریں (افسانہ)، مطبوعہ: سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۳، ۲۰۱۴ء، ص ۲۴

۳۱۔ آغا گل، کالی پت، مطبوعہ: سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۵، اپریل تا جون ۲۰۱۵، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ص ۱۰۷

۳۲۔ رشید مصباح، خاک زادے (افسانے) مطبوعہ: سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۷، ۲۰۱۵ء، ص ۱۰۷

۳۳۔ محولہ بالا

۳۴۔ جمیل حیات، صورِ اسرافیل (افسانہ)، مطبوعہ: سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۱۳، ۲۰۱۷ء، ص ۹۹

۳۵۔ فرخ ندیم، کچھ لکھنے سے پہلے (افسانہ)، مطبوعہ سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۰، جون تا دسمبر ۲۰۱۳ء، ص ۱۴۱

۳۷۔ عرفان عرفی 'فریم سے باہر (افسانہ)' مطبوعہ: سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۰، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۳ء، ص ۱۲۷
۳۸۔ صبا اکرام، جدید افسانہ، چند صورتیں، زین پبلی کیشنز، کراچی، بار اول، دسمبر ۲۰۰۱ء، ص ۴۷
۳۹۔ حنیف باوا 'آس کی لرزتی لو (افسانہ)' مطبوعہ: سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۴، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۵ء، ص ۱۰۸۔۱۰۹
۴۰۔ سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر، جدید اردو افسانے کے رجحانات، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۱۶ء، ص ۶۲۴
۴۱۔ رشید مصباح، خاک زادے (افسانہ)، مطبوعہ سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۷، ۲۰۱۵ء، ص ۱۰۹
۴۲۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، اردو افسانہ، بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں، پورب اکادمی، اسلام آباد، فروری ۲۰۰۸ء، ص ۲۹۸
۴۳۔ تاج الدین تاجور، ڈاکٹر، اردو نظم پر نائن الیون کے اثرات (مضمون)، مطبوعہ: پاکستانی زبان و ادب پر نائن الیون کے اثرات، ص ۳۴
۴۴۔ آغا گل، مس کنڈکٹ (افسانہ)، مطبوعہ: سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۰، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۳ء، ص ۸۷
۴۵۔ طاہر اقبال، پاکستانی اردو افسانہ، سیاسی و تاریخی تناظر میں، ص ۶۲۵
۴۶۔ نور زاہدی، پرانے کاغذوں میں (افسانہ)، مطبوعہ: سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۲۰، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۴ء، ص ۴۱۔۴۰
۴۷۔ طاہرہ اقبال، پاکستانی اردو افسانہ، سیاسی و تاریخی تناظر میں، ص ۶۵۰
۴۸۔ رشید مصباح، خاک زادے، مطبوعہ: سہ ماہی ادبیات، ص ۱۰۹
۴۹۔ نیاز محمود، پیوند (افسانہ)، مطبوعہ: سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۱۳، ۲۰۱۷ء، ص ۱۳۴
۵۰۔ محولہ بالا
۵۱۔ محولہ بالا
۵۲۔ ریاض مجید، ڈکٹر، ۹/۱۱ کے اردو غزل پر اثرات (مضمون)، مشمولہ: پاکستانی زبان و ادب پر ۹/۱۱ کے اثرات، ص ۱۱
۵۳۔ نجیبہ عارف (مرتبہ)، ڈاکٹر، ۹/۱۱ اور پاکستانی اردو افسانہ، ص ۴۶
۵۴۔ خالدہ حسین، پائیدپائیپر، مطبوعہ: سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۹۸، جنوری تا مارچ ۲۰۱۳ء، ص ۱۶

۵۵۔ نوشین توقیر، پاکستانی اردو افسانے پر نائن الیون کے اثرات (مضمون)، مشمولہ: پاکستانی زبان و ادب پر نائن الیون کے اثرات، ص ۱۱۳

۵۶۔ عرفان عرفی، فریم سے باہر (افسانہ)، مطبوعہ: سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۰، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۳ء، ص ۱۳۱

۵۷۔ صبا اکرام، جدید اردو افسانہ، چند صورتیں، ص ۸۰

۵۸۔ زیف سید، حکیم صاحب، شمارہ ۱۰۵، ۲۰۱۵ء، ص ۸۹

باب سوم:

معاصر اردو افسانہ اور عالمگیریت

الف۔ عالمگیریت: تعارف اور پس منظر:۔

اردو اصطلاح 'عالمگیریت' لفظ عالمگیر ہی سے ماخوذ ہے۔ یہ بنیادی طور پر عربی زبان کا لفظ ہے۔ لغوی طور پر اس سے مراد ہے علاقائی یا مقامی رسم و رواج کو عالمگیر بنانا یعنی پوری دنیا میں ایک جیسے رسم و رواج اور مظاہر موجود ہوں۔ ترقی یافتہ ممالک اور پسماندہ ممالک کے درمیان تہذیبی خلا کم ہو بلکہ لندن، ٹوکیو، ممبئی اور کراچی میں افراد ایک جیسا سوچیں اور عمل کریں۔

اوپر دیے گئے شہروں کی مثالوں سے مراد یہ ہے کہ ان میں جتنا بھی مکانی بُعد ہو لیکن دنیا کے دور دراز علاقے کسی ایک رواج کے تابع ہوں تو اس کو ہم عالمگیریت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ دراصل عالمگیریت مقامیت یا علاقائیت کے خاتمے کا نام ہے، اب اس کا مطلب ہوا کہ عالمگیریت دراصل اس طوفان کا نام ہے جس میں مقامیت یا کسی علاقے کے مخصوص کلچر، وہاں کے رسم و رواج اور روایات ساتھ ساتھ اقدار بھی اس طوفان کے نیچے دب کر رہ جاتے ہیں۔ عالمگیریت اتنی آسان اصطلاح نہیں ہے یہ بہت پیچیدہ ہے۔ تجارت سے لے کر معاشرت تک یہ مختلف معانی میں استعمال ہوتی ہے۔ دانشوروں نے بھی اپنے اپنے طور پر اس کی مختلف تعریفیں کرنے کی سعی کی ہے۔ مبین مرزا نے عالمگیریت کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

> "عالمگیریت دراصل وہ ایجنڈا ہے جو کہ رنگوں، نسلوں، زبانوں اور عقیدوں کی اس دنیا کی نئی تشکیل سے عبارت ہے۔ ایسی نئی تشکیل جس میں دنیا کی سب اقوام اور سارے افراد ایک ہی سانچے میں ڈھلی ہوئی زندگی گزارتے نظر آئیں۔"(۱)

عالمگیریت دراصل عالمی سازش کا ایک شاخسانہ قرار دی جا سکتی ہے۔ اس کے پسِ پشت مخصوص سیاسی، سماجی اور تجارتی مقاصد کار فرما ہیں۔ عالمگیریت کے واضح عزائم ہیں کہ مقامیت کو ختم کرنا، علاقائیت سے جان چھڑانا اور مغربی تہذیب کا غلبہ ہی دراصل عالمگیریت کے عزائم ہیں۔ لوگوں کو ان کے مقام،

رواجات سے دور کرنا عالمگیریت کا سب سے پہلا نعرہ ہے۔ عالمگیریت ایک نئی دنیا کی تشکیل کا نام ہے۔ جس کے مطابق دنیا کے افراد میں مکانی بُعد بالکل نہیں ہے بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پوری دنیا ایک گاوں کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ عالمگیریت اپنے جلو میں مثبت کے ساتھ ساتھ منفی پہلو بھی لیے ہوئے ہے۔

عالمگیریت کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ ایک ایسی عملیت جس سے ساری دنیا کے لوگ ایک معاشرے میں متحد ہو جائیں اور تمام افعال اکٹھے سر انجام دیں۔ یہ بڑا خوش کن اور پُر فریب خیال ہے۔ اس کو ڈاکٹر سلیم اختر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> "عالمگیریت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سرحدیں ختم ہو گئیں، ملک یکجا ہو گئے اور مختلف النسل انسانی گروہ عالمی برادری میں تبدیل ہو کر صحیح معنوں میں اولاد آدم بن گئی۔ اقتصادی اور سیاسی مفہوم کے متوازی عالمگیریت دوسری تہذیبوں، کلچرز، تخلیقات و تصورات کی آزاد حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے ان سے اخذ استفادہ ہے۔"(۲)

عالمگیریت کو انگریزی میں Globalization کہا جاتا ہے۔ آکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق یہ لفظ پہلی دفعہ ۱۹۳۰ء میں سامنے آیا۔ ۱۹۵۱ء میں ڈکشنری میں لفظ شامل ہوا۔ مارشل میکلعن نے ۱۹۶۲ء میں گلوبل ویلج کی اصطلاح تراشی۔ اس کے بعد اس لفظ کا استعمال شروع ہوا لیکن اس لفظ کو ہم جتنا سادہ سمجھ رہے ہیں اتنا سادہ ہے نہیں۔ اس نے مختلف رنگ اختیار کیے۔ اس کی تشریح بھی مختلف انداز سے کی گئی۔ بی بی سی کی ویب گاہ پر اس بارے میں ایک مضمون شائع ہوا ہے کہ جو اس اصطلاح کے بارے میں کافی معلومات افزاء ہے۔ اس سے اقتباس درج ہے:

> "معیشت کے ماہرین کے مطابق اکیسویں صدی میں اس اصطلاح کا سب سے زیادہ غلط استعمال ہوا۔ ماضی قریب میں ایسا کوئی لفظ ذہن میں نہیں آتا جس نے اتنے مختلف معانی اختیار کیے ہوں۔"(۳)

اس طرح یہ اصلاح تجارتی میدان میں اپنا الگ مفہوم رکھتی ہے جبکہ سماجی طور پر اس کا علیحدہ مفہوم ہے۔ البتہ انگریزی کی اصطلاح "گلوبلائزیشن" کی تعریف بھی درج کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ اس

اصطلاح کی تمام جہات کا احاطہ کیا جا سکے:

> "Globalization is the word used to describe the interdependence of the world economic, culture and population, brought by cross-bordertrade in goods and service, technology and flows of investment and information."(۴)

گلوبلائزیشن کی اصطلاح دراصل ان تعلقات کی طرف اشارہ ہے جو جدید قوموں کے مابین پیدا ہو رہے ہیں۔ قوموں کی معاشی، سیاسی اور سماجی ضرورتیں انہیں ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات استوار کرنے پر اکساتی ہیں۔ اس طرح ان کے درمیان رابطہ شروع ہو جاتا ہے اور اس تعلق کو بھی گلوبلائزیشن کی ایک جہت سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ گلوبلائزیشن دراصل سوچی سمجھی چال کہی جا سکتی ہے۔ جس کے تحت کمزور اور غریب ممالک کو ترقی یافتہ اور مغربی ممالک بطور منڈی استعمال کر کے ان کے وسائل کو لوٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ عالمگیریت بھی دراصل نئی جہات رکھتی ہے۔ اس کے فوائد اور نقصانات پر آئندہ صفحات پر بحث ہو گئی یہاں پر دیکھنا یہ ہو گا کہ عالمگیریت کا آغاز کب ہوا؟ دراصل عالمگیریت کا جدید مفہوم تو بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں سامنے آیا لیکن قدیم عہد میں بھی عالمگیریت کے نشانات ملتے ہیں۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ Globalization is as old as human race۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابتداء میں جب ایک علاقے کے انسان نے دوسرے علاقے کا رخ کیا تو وہاں پہنچ کر وہ کسی دوسرے فرد سے ملا تو اس نے وہاں سے کئی نئی چیزیں سیکھیں۔ پھر وہ چیزیں اس نے اپنے معاشرے میں نافذ کیں اور معاشرتی طور پر ایک قدم انسان آگے چلا گیا۔ محققین نے اس کو عالمگیریت کی ابتدائی شکل تصور کیا ہے۔ محققین کا اصرار اس بات پر بھی نظر آتا ہے کہ انسانوں نے جب اپنے علاقے کا رخ کیا۔ نئے نئے جزیرے دریافت کیے تو یہ بھی عالمگیریت کی ایک شکل تھی جس میں دو علاقوں کے لوگوں کا آپس میں ملاپ ہوا۔ انسان نے کھیتی باڑی کا کام بھی ایسے ہی سیکھا ہے اور ایک جگہ اس کام کو اختیار کیا گیا وہاں سے یہ پوری دنیا میں پھیل گیا۔ پھر ایک جگہ پر کوئی مخصوص چیز پیدا ہوئی جبکہ کسی دوسری سرزمین میں ضرورت کی اور چیز پیدا ہوئی تو وہاں یہ ضروری ہو گیا

کہ افراد آپس میں اشیاء کا تبادلہ کریں۔ یہی تجارت کی اولین شکل نظر آتی ہے جس کو اصطلاح میں بارٹر سسٹم بھی کہا جاتا ہے۔ انسان جب زرعی زندگی میں رہتا تھا تو اس کی ضروریات اسی بارٹر سسٹم کے تحت پوری کی جاتی تھی۔

پھر تاریخ کے دھارے نے ایک اہم موڑ لیا، صنعت کے فروغ نے مختلف ممالک میں صنعتی انقلاب لایا اور کچھ ممالک ترقی یافتہ ممالک کی صف میں کھڑے ہو گئے۔ برطانیہ اور فرانس ان ممالک میں سرفہرست تھے۔ برطانیہ نے پھر دوسرے ممالک کو اپنا مطیع بنانے کا فیصلہ کیا، جس میں وہ کافی حد تک کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے برصغیر کو بھی اپنا غلام بنایا اور یہاں اپنی نو آبادیات قائم کیں۔ فرانس نے بھی یہاں کا رخ کیا۔ بنگال میں فرانس کا اثر و رسوخ بھی کافی تھا لیکن کرناٹک کی جنگوں کے بعد قدرے کم ہو گیا۔ اس طرح مشرق اور مغرب میں ملاپ ہوا۔ مغرب کے باشندوں کو یہاں کے لوگوں نے دیکھا۔ کچھ نے ان کی عادات کو اپنایا اور کچھ نے ان کے خلاف عَلم بغاوت بلند کیا۔ اس طرح یہ بھی گلوبلائزیشن کا ایک اہم دور تصور کیا جاتا ہے۔ جب صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک نے ترقی کی اور پھر دوسرے ممالک کو دو مقاصد کے تحت قبضے میں لیا۔

پہلا مقصد یہ تھا کہ اپنے ملک کی صنعتوں میں تیار ہونے والے صنعتی مال کے لئے وسیع منڈی مہیا کرنا۔ دوسرا مقصد صنعتوں کے لئے خام مال حاصل کرنا یعنی مفتوحہ ممالک کے ذخائر پر قبضہ کر کے اس سے بھرپور فائدہ حاصل کرنا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کئی ملٹی نیشنل کمپنیاں وجود میں آئیں اور انہوں نے دوسرے ممالک کا رخ کیا۔ جہاں جہاں ان کمپنیوں کو کمزور ممالک کی سیاست میں خلا نظر آیا تو انہوں نے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ یہاں کی سیاست میں دخل اندازی کرتے ہوئے کمزور ممالک کو اپنا محکوم بنالیا۔ اس کی ایک مثال ایسٹ انڈیا کمپنی بھی ہے۔ صنعتی دور میں ذرائع نقل و حمل کی ترقی نے فرد کو ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرنے کے لئے آسانیاں فراہم کیں۔ یہی وجہ ہے کہ آمدورفت کی ترقی کے بعد فرد کی نقل مکانی میں اضافہ ہوا۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

"Migration from the old to the new world went through three stages 1600-1790. Slaves and contract labour: 1790-1850. Free settlers: 1850-1920. Mass migration.If

the case of mass migration from Europe to Primarily the US, Canada, Australia and Argentina 300,000 per annum moved between 1850 and 1880, 600,000 between 1880 and 1900 and over a million between 1900 and 1920."(۵)

مندرجہ بالا اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ انسانی نقل مکانی سترھویں صدی سے بتدریج ترقی کرتی گئی۔ مختلف تہذیبوں کے افراد کا باہمی رابطہ ہی عالمگیریت ہے۔

اس نقل مکانی کے دور کو محققین نے تین ادوار میں تقسیم کر کے واضح طور پر بتایا ہے کہ پہلے دور میں یورپ سے امریکہ، کینیڈا اور ارجنٹائن میں تین لاکھ سالانہ لوگوں نے ہجرت کی، اگلے دور میں چھ لاکھ سالانہ لوگوں نے یورپ سے متذکرہ بالا علاقوں میں ہجرت کی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں ایک ملین سالانہ لوگوں نے ہجرت کی۔ اب نقل مکانی کا تصور بدل چکا ہے۔

بے شمار لوگ ایک ملک سے دوسرے ملک آسانی سے تھوڑے وقت میں سفر کرتے ہیں۔ اس اقتباس سے ظاہر ہوا کہ صنعتی ترقی کے بعد جب نقل و حمل میں ترقی کے آثار نظر آئے تو افراد کا رابطہ بھی بڑے پیمانے پر ہوا۔ اب تو دنیا کی حالت ایسے ہی ہے:"ہماری دنیا بین الاقوامی ہے۔ہستی کی existence فضاء سے نکل کر بین الاقوامی طاقتوں کی مرہون منت ہو گئی ہے۔"(۶)

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گلوبلائزیشن میں مزید ترقی آتی گئی۔ مختلف ممالک کے افراد کا آپس کا میل جول مزید بڑھا۔ ٹیلی فون کی ایجاد نے انسان کو مزید ایک قدم آگے بڑھایا۔ پھر ذرائع مواصلات نے ترقی کی تو انٹرنیٹ نے عالمگیریت کے سلسلے میں انقلاب برپا کیا۔ اب جہاز، ٹیلی فون اور انٹرنیٹ کی موجودگی میں سفر آسان تر، رابطہ سہل ترین اور افراد کا ملاپ آسان ہو گیا ہے۔ متذکرہ بالا تین اشیاء کو محققین نے عالمگیریت کا نمائندہ کہا ہے:

"The airplane, the telephone and the internet are just three inventions which are attributable to spread of Globalization."(۷)

ذرائع مواصلات میں برق رفتاری سے ترقی ہی نے افراد کہ یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ پوری دنیا ایک گاؤں ہے اس لئے مارشل نے ۱۹۹۲ء میں دنیا کو 'گلوبل ویلج' کہہ دیا۔

بعض محققین نے جدید گلوبلائزیشن کو امریکہ کے ڈھکوسلا بھی قرار دیا ہے۔ عالمگیریت دراصل معاشی مفادات کی آڑ میں امریکہ اور چند یورپی ممالک کے ہاتھ میں کھیل رہی ہے۔ عالمی بینک اور بین الاقوامی مالیاتی فنڈ دراصل دو ایسے جال ہیں جو غریب ملکوں پر پھینکے جاتے ہیں۔ عالمگیریت کی آڑ میں معاشی اقدامات اس اقتباس میں واضح ہیں:

> "۱۹۸۹ء میں دیوارِ برلن کے انہدام سے امید کی کرن دل لبھانے لگی کہ شاید دنیا والوں کو مل جل کر رہنے کی آرزو ہونے لگی۔ ۱۹۹۴ء میں یوروگوئے کانفرنس میں ایک تنظیم کے قیام کی وکالت کی گئی۔۔۔ یہ سب عالمگیریت کی شروعات تھی، جسے ۱۹۹۵ء میں سان فرانسسکو میں ہونے والی کانفرنس میں جس میں روسی صدر گورباچوف کے علاوہ دنیا کے ۵۰ سیاسی، اقتصادی ماہرین نے حتمی شکل دی۔ عالمگیریت کو عملی شکل دینے میں GATT جس کا نیا نام WTO قرار پایا۔ عالمی بینک اور انٹرنیشنل مانٹیری فنڈ (IMF) نے اہم کردار ادا کیا۔"(۸)

عالمگیریت کے درپردہ متذکرہ بالا اداروں کے ذریعے امریکہ نے معاشی مفادات حاصل کیے ہیں۔ اس طرح عالمگیریت کی یہ منفی جہت سامنے آتی ہے۔ عالمگیریت کے فوائد اور نقصانات پر بھی طائرانہ نگاہ ڈالی جائے تو بات زیادہ واضح انداز میں سامنے آئے گی۔

عالمگیریت نے انسان کو بے شمار فوائد سے نوازا ہے۔ ان میں سرفہرست افراد کا آپس میں تیز ترین اور سہل رابطہ ہے۔ اب جدید عہد میں فرد دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پیغام آسانی سے، جلدی اور سستے ذرائع کے ذریعے پہنچا سکتا ہے۔ حالات سدا ایسے نہ تھے بلکہ ابھی ماضی قریب ہی کی بات ہے: "نیویارک سے لندن تین منٹ کی کال ایک ڈالر میں پڑتی ہے جبکہ انیس سو تیس میں یہ کال تین سو ڈالر میں پڑتی تھی۔"(۹)

اس طرح سہل رابطوں کی وجہ سے انسانی تعلقات میں مزید ترقی آئی ہے۔ آج انسان دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک ویڈیو کال کے ذریعے بھی بات کر سکتا ہے۔

عالمگیریت کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے انسانوں کے لئے خوراک کا مسئلہ حل ہو گیا ہے اب دنیا کے ایک کونے میں اگر خوراک کم ہے تو دوسرے کونے سے آسانی سے خوراک پہنچائی جا سکتی ہے۔

اس کے طفیل فرد کو دوسری تہذیبوں کو سمجھنے کا موقع ملا ہے۔ اب انٹرنیٹ کے ذریعے ہم دوسرے ممالک اور ان کے افراد کے بارے میں آسان سے جان سکتے ہیں۔ دنیا کے کسی بھی موضوع پر آسانی سے کتب حاصل کی جا سکتی ہیں۔ عالمگیریت کے فوائد سے زیادہ نقصانات ہیں۔

عالمگیریت کی وجہ سے دنیا کے دور دراز ملکوں میں پیدا ہونے والی بیماریاں دوسرے ملکوں میں منتقل ہو جاتی ہے جیسا کہ: "ایڈز کی بیماری کا آغاز افریقہ اور جنوبی امریکہ سے ہوا اور اب پوری دنیا میں پھیل گئی ہے۔ ہر روز چودہ ہزار افراد اس بیماری کا شکار ہوتے ہیں۔"(۱۰)

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فرد کی ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل مکانی میں تیزی آنے کی وجہ سے بیماریوں کی بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی کوئی انہونی نہیں ہے۔ اسی طرح عالمی گاؤں کا یہ مسئلہ بھی بہت خطرناک ہے۔

عالمگیریت کی دوسری جہت یہ ہے کہ اس کے درپردہ دراصل مغربی ممالک کی تہذیب، ثقافت اور زبان کو مشرقی ممالک میں رائج کرنے کی کوشش ہے۔ اس کی وجہ سے قومی تہذیبیں جو کسی ملک کی پہچان ہوا کرتیں تھیں اب معدوم ہو رہی ہیں۔ ہمیں ایسا نظر آ رہا ہے کہ آئندہ ادوار میں پوری دنیا میں صرف امریکیت اور مغربیت ہی غالب تہذیبیں ہوں گی۔

فرد نے سائنسی طور پر حیران کن ترقی کی ہے لیکن جو انسان ستاروں کی گزرگاہوں کو تلاش کر کے اور سیاروں پر کمندیں ڈال چکا ہے وہ انسانیت کے بنیادی رموز کو فراموش کر چکا ہے۔ اب تمام اعلیٰ دینی، اخلاقی اور معاشرتی اقدار عالمگیریت کے سیل تندرو میں خس و خاشاک کی طرح بہہ چکی ہیں۔ اس کی طرف مبین مرزا نے اپنے ایک مضمون میں اشارہ کیا ہے:

> "غور کیجئے کہ اس عہد میں انسانی معاشرت اور تمدن کے بہت سے بنیادی تصورات میں تبدیلی آ چکی ہے۔ مساوات، بھائی چارہ، ہم آہنگی، رواداری، روشن خیالی، وابستگی اور مصالحت کے آج وہ معنی نہیں ہیں جو اس سے پہلے رائج رہے ہیں۔"(۱۱)

عالمگیریت کی ایک منفی جہت یہ ہے کہ سرمایہ دار ملک دراصل غریب ممالک کو اپنی مصنوعات کے لئے منڈی بنانا چاہتے ہیں اسی مقصد کے لئے فرنگ نے عالمی بینک، ڈبلیو ٹی او اور آئی ایم ایف جیسے بتانِ آزری کو تراشا ہے۔ ان اداروں کی ساخت ایسی بنائی ہے کہ غریب ممالک کو مزید غریب کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح عالمگیریت نے بعض ممالک پر منفی اثرات مرتب کئے ہیں۔

عالمگیریت نے ہمارے ہاں پرانی تہذیب کی بنیادیں بھی ہلا کر رکھ دی ہیں۔ اب تہذیبی اقدار قصہ پارینہ بن چکی ہیں۔ پہلے بھی ذکر ہوا کہ عالمگیریت کے درپردہ مغربیت اور امریکیت کو فروغ دینے کی کوشش کی جا رہی ہے جس کی وجہ سے تمام مقامی اور علاقائی تہذیبوں بلکہ ملکی تہذیبوں کو خطرات لاحق ہیں۔ اب مغربیت کی یلغار نے جس طرح کے جنسی و نفسیاتی مسائل کو جنم دیا ہے ان کا تذکرہ الگ باب کا متقاضی ہے۔

جب عالمی منظر نامے پر اس قدر تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں تو انسانی تہذیب، ثقافت اور سوچوں کا آئینہ جو کہ ادب ہے متاثر ضرور ہوا ہے۔ اب جدید تہذیبی اقدار فروغ پا رہی ہیں۔ جدید ٹیکنالوجی نے حالات کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ پرانی تہذیب قصہ پارینہ بن چکی ہے۔ ان تمام عوامل کے اثرات ادب پر بھی پڑے ہیں۔ محمد حمید شاہد نے بھی ان تبدیلیوں کو محسوس کیا ہے:

> "معاشرہ جو پہلے بہت پھیلا ہوا تھا۔ بس ملکوں اور قوموں کی سرحدیں اور لکیریں ان معاشروں کو شناخت عطا کرتی تھیں۔ تب دکھ سکھ ان معاشروں کے اندر سے پھوٹتے تھے۔ مگر پچھلے کچھ عرصے سے یوں محسوس ہونے لگا ہے جیسے دنیا یکدم سکڑ گئی ہے۔ ساری لکیریں مٹ گئی ہیں۔ ساری شناختیں معدوم ہو گئی ہیں۔ گلوبل ویلج بنتی اس دنیا میں اب اندر کے دکھوں سے کہیں بڑے دکھ باہر سے آتے ہیں۔"(۱۳)

اس طرح عالمگیر معاشرہ دراصل کئی تبدیلیوں کا موجب بن چکا ہے۔ اب ایک سال کے بعد دوسرا سال جب آتا ہے تو گزرا ہوا سال موجودہ ترقی دیکھ کر قصہ پارینہ معلوم ہوتا ہے۔ ادیب معاشرے کا حساس ترین فرد ہوتا ہے جو انسان تو کیا لالہ و گل سے کلام پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج معاشرے کی تمام جہات کی عکاسی کرتا ہوا اردو ادب کا ادیب عالمی گاؤں کا رکن نظر آتا ہے۔ "ہمارا جدید افسانہ زمین اور زمانے سے اوپر اٹھ کر ادب کے عالمی گاؤں کا رکن بن گیا ہے۔"(۱۴)

جب معاصر صورتحال کی بات آتی ہے تو معاصر افسانہ معاشرتی سطح پر اور عالمی منظرنامے پر رونما ہونے والی تبدیلیوں کا بھرپور عکاس نظر آتا ہے۔ اس باب میں ہم معاصر اردو افسانے پر عالمگیریت کے اثرات کا جائزہ لیں گے۔

ب۔ معاصر افسانے پر عالمگیریت کے اثرات:

عالمگیریت دراصل مقامی شناختوں کے خاتمے کا نام ہے جس میں پوری دنیا کی تہذیبوں اور ثقافتوں میں فرق پوری طرح ختم ہو رہا ہے اور ایک ہی تہذیب غالب آ رہی ہے جس کے اثرات پوری دنیا میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس تہذیب کے اپنے خدوخال ہیں جن کے اثرات ادب پر بھی نمایاں ہیں۔ آج جب ہر پل ہر لمحہ نئے حالات جنم لیتے ہیں۔ پرانی اقدار کا خاتمہ ہو رہا، نئی تہذیب جنم لے رہی۔ اب معاصر افسانہ نگاروں کے ہاں اس تہذیب کا نوحہ ہی نظر آتا ہے۔ مزید برآں ہر گزرتے دن کے ساتھ جدید سے جدید تر ٹیکنالوجی ہمارے سامنے آ رہی ہے اس کے اثرات بھی معاشرے پر پڑتے ہیں اور ادیب ان اثرات کو اپنے فن پاروں میں ہمیشگی بخش دیتا ہے۔ اقدار کے زوال کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب جو مشرقی تہذیب پر غالب آتی جا رہی ہے اس کا گہرا شعور معاصر افسانہ نگار کے ہاں موجود ہے۔ اقدار کا زوال بھی ہمارے عہد کا ایک بڑا المیہ ہے۔ ان تمام عوامل کو افسانے کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

i۔ پرانی تہذیب کا نوحہ:

جب سے سائنسی ترقی میں برق رفتاری آئی ہے ہر چیز بدل رہی ہے۔ پرانی تہذیب و ثقافت پوری طرح معدوم ہو رہی ہے۔ مٹی کے دیے کی جگہ اب بجلی کے بڑے بڑے قمقموں اور انواع و اقسام کے بلبوں نے لے لی ہے۔ دوسری طرف ٹی وی نے دادی اماں کے قصوں کے دور کو بھی ہڑپ کر لیا ہے۔ ایسی کئی چیزیں جو ہماری مشرقی تہذیب کا خاصہ تھیں اب قصہ پارینہ بن چکی ہیں۔ اب شہر اور گاوں میں فاصلے کم ہوتے جا رہے ہیں۔ دیہات کے ساتھ جو فطرت نگاری مخصوص تھی اب اس کا آہستہ آہستہ خاتمہ ہو چکا ہے۔ اس کی جگہ شہر کی مصنوعی زندگی نے لے لی ہے۔ ڈاکٹر صاحب علی کی رائے سے اتفاق کیے بغیر نہیں رہ سکتے: ”موجودہ دور میں دیہی ترقی ناقابل تردید حقیقت ہے مگر جو گاوں کی تہذیب اور کلچر ہے وہ معدوم ہو رہا ہے۔ اس درد کو

دیسی باشندے شدت سے محسوس کر رہے ہیں۔"(۱۴)

اب شہروں کو پھیلنے کا عارضہ لاحق ہو چکا ہے۔ شہروں کے اطراف جو گاؤں تھے اب وہ شہر کے مرکز میں آ چکے ہیں۔ شہروں کے اس طرح پھیلنے کا احساس معاصر ادیبوں کے ہاں واضح طور پر نظر آتا ہے۔

اس تیزی کے ساتھ سادگی اور فطری ثقافت کے خاتمے پر معاصر افسانہ نگار نوحہ کناں نظر آتا ہے اور بدلتی ہوئی اقدار پر مایوس دکھائی دیتا ہے۔ زمانی ترتیب سے ادبیات پر نظر ڈالیں تو شمارہ ۹۷ میں خالد فتح محمد کا افسانہ "بے جان جاندار" اس حوالے سے خاصے کی چیز ہے۔ افسانے سے اقتباس ملاحظہ ہو۔

> "ہم تو جناب درویش صفت لوگ ہیں یہ تو بس بچوں کے لئے ایک آسرا ہے۔ والد بزرگوار نے ہمیں اور ان کے والد نے انہیں یہی بتایا کہ زندگی سادہ اور رہائش سادہ تر ہونی چاہئے لیکن جناب آپ تو جانتے ہیں کہ زمانہ بدل گیا ہے اب انکسار اور وضع داری تو ماضی کا قصہ ہیں۔ ہر چیز میں نمائش، دکھاوا، اور جھوٹی شان کو عمل دخل ہے۔"(۱۵)

سادگی کی جگہ آج نمود و نمائش نے لے لی ہے۔ ہر چیز میں نمود و نمائش کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ لوگوں کے درمیان مقابلے کی فضا نے جنم لے لیا ہے۔ فیشن والا لباس ہو یا کہ خوبصورت گھر، ہر جگہ دکھاوا واضح نظر آتا ہے۔ آج کا فرد دراصل سیلفی کلچر میں پوری طرح گرفتار ہو چکا ہے۔ وہ لباس نمود و نمائش کے لئے پہنتا ہے۔ وہ اچھا کھانا بھی کھاتا ہے تو لازمی طور پر کوشش ہوتی ہے کہ دوسروں کو دکھایا جائے وہ موبائل کے ذریعے فوراً تصویر لے کر سوشل میڈیا پر ڈال دیتا ہے۔ اس کا مقصد صرف اور صرف دوسروں پر رعب جمانا اور اپنے آپ کو بہتر زندگی گزارنے والا بنا کر پیش کرنا ہوتا ہے۔ اس سے کئی منفی اثرات جنم لیتے ہیں۔ غریب افراد میں احساس کمتری کا رجحان بھی اسی نئی قدر کا نتیجہ ہے۔ آج کے فرد نے اپنے آپ کو آسائشات کا بہت زیادہ اسیر کر لیا ہے۔ علامہ اقبال بھی یہ شکوہ بہت پہلے کر گئے تھے۔

ترے صوفے ہیں افرنگی، تیرے قالین ہیں ایرانی
لہوں مجھ کو رلاتی ہے، جوانوں کی تنِ آسانی(۱۶)

اس آسائش کا شکار ہو کر ہمارے قویٰ مضمحل ہو جائیں گے بلکہ ہو چکے ہیں۔ مغرب سے آنے والی ہر

سائنسی ایجاد نے انسان کو تن آسان بنا دیا ہے جب اس قدر آسائش ہو، دکھاوا ہو، جھوٹی شان و شوکت ہو تو انکساری جیسی مثبت اور بڑی اقدار ختم ہو جاتی ہیں۔ یہ تمام نحوستیں دراصل مغرب کے ذریعے ہی مشرق میں آتی ہیں اور ادیب کے ہاں اس کا گہرا شعور موجود ہے۔ خالد فتح محمد نے متذکرہ بالا افسانے میں اس تبدیلی کو شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہوئے بیان کیا ہے۔

انسان کا دنیا کے دوسرے علاقوں میں بسنے والے انسان سے کچھ تعلق پہلے بھی تھا۔ انسان دوسرے علاقوں کا رخ کرتا تھا۔ یہ اسفار دراصل خوراک کے حصول کے لئے کئے جاتے تھے ان سفروں کے پیچھے کوئی مہماتی مقاصد یا تفریح کی غرض و غایت شامل نہ ہوتی تھی۔ اس کے متعلق سید عامر سہیل نے لکھا ہے:

> "انسان کا زمین کے دوسرے خطوں میں بسنے والے انسانوں سے تعامل رہا۔۔۔ یہ تعامل اتنی سست رفتاری سے ہوا کہ اس کے ذریعے کوئی بڑی تبدیلی وقوع پذیر نہ ہوتی تھی۔۔۔ سفر سے واپس آنے والے انسان نئی تہذیبوں، مذاہب اور جغرافیوں کا احوال سناتے اور لوگ دانتوں میں انگلیاں داب کر اسے سنتے، تخیل کا گھوڑا سرپٹ دوڑتا اور داستانیں وجود میں آتیں۔"(۱۷)

آج حالات یکسر بدل گئے ہیں زندگی بہت برق رفتار ہو چکی ہے۔ ہر گزرتا سال ماضی بعید کی طرح پرانا دکھائی دیتا ہے۔ آج انسانوں کے مابین رابطہ تیز تر ہو گیا ہے۔ انسان نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کرنے والے آلات دریافت کر لئے ہیں۔ اب انسانی عالمی گاؤں کا حصہ ہے جسے دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک رونما ہونے والے واقعات کی خبر حاصل ہوتی ہے۔ سفری حالات یا سفری داستانیں سنانے کا رجحان کم ہو گیا ہے۔ اب لوگ خود انٹرنیٹ کے ذریعے معلومات حاصل کر لیتے ہیں۔ آج کے افسانہ نگار بھی اس گزرتی ہوئی زندگی کے بارے میں کف افسوس ملتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بہت سے افسانوں میں ماضی پرستی کا رجحان نمایاں ہے۔ دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو کے راگ الاپتے نظر آتے ہیں:

> "ہمارے اس موجودہ وقت سے گزرا ہوا زمانہ کتنا اچھا اور مختلف تھا۔ اللہ کی مخلوق کی بھی اتنی بھیڑ بھاڑ نہ تھی۔ دیہات میں وسیع مکانات کے کھلے صحن ہوا کرتے تھے۔

صحن کی ایک طرف رہن سہن کے استعمال کی جگہوں سے کافی پرے ایک گڑھا سا کھودا گیا ہوتا جس میں گھر کا کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا تھا۔ اکثر گھرانوں کے بچے، بوڑھے اور جوان رفع حاجت کے لئے کھیتوں کا رخ کرتے۔ شہروں میں بھی یہ آج کے فلش سسٹم نہیں تھے جو زمین کے اندر آلودگی پھیلانے کا سبب بنتے ہیں۔"(۱۸)

مندرجہ بالا اقتباس زیتون بانو کے افسانے 'ڈسٹ بن' سے اخذ کیا گیا ہے۔ جو ادبیات کے شمارہ نمبر اٹھانوے میں شائع ہوا۔ اس زمانے میں ماضی کی معاشرت کو بھرپور انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ دراصل اس وقت ماحول پر سکون تھا، آبادی کم ہونے کی وجہ سے شور کی آلودگی کم تھی لیکن آج کے دور میں آبادی بڑھ گئی ہے۔ شہر بہت گنجان ہو چکے ہیں۔ ان حالات میں عصر حاضر کا فرد جائے سکون کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ یہ ہمارے عہد کا المیہ ہے۔ دیہاتی تہذیب جس میں بڑے بڑے کچے مکانات ہوا کرتے تھے اب بالکل بدل چکی ہے، اس پر بھی شہری زندگی غالب آتی جارہی ہے۔ شہری زندگی کا شور، مصروفیت اور بے سکونی نے دیہاتی زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ رہن سہن کے طریقے پوری طرح بدل چکے ہیں، انسان آسائش کا گرویدہ ہو گیا ہے، گاؤں کی سخت زندگی کی بجائے تن آسانی عام ہو گئی ہے۔ مٹتی ہوئی تہذیبی قدروں کی جانب ڈاکٹر نذیر تبسم نے بھی اشارہ کیا ہے:

"ساری دنیا کے ایک عالمی گاؤں میں سمٹنے کے تصور نے مختلف اقوام کی تہذیبی شناخت پر کاری ضرب لگانا شروع کر دیا ہے۔ انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی۔ سیٹلائٹ کی سہولت اور سینکڑوں چینلز کی دستیابی نے مختلف زبانوں اور ثقافتوں کی مخصوص مہکار کو مجروح کر دیا ہے۔"(۱۹)

ہماری بدلتی ہوئی دنیا جب عالمی گاؤں کی شکل اختیار کر چکی ہے تو اس عالمگیریت کے سیلاب نے دوسرے ممالک کی مقامی تہذیب اور شناختوں پر منفی اثرات مرتب کئے ہیں بلکہ عالمگیریت کے درپردہ مغربی تہذیب اور امریکیت غالب آتی جارہی ہے مقامی تہذیبوں کی کئی قدریں اس ریلے میں خس وخاشاک کی طرح بہہ رہی ہیں۔ اس دور میں بیماریوں کی کثرت ہے۔ اب بڑی بڑی بیماریاں معمول معلوم ہوتی ہیں۔ آج سے کچھ

عرصہ پہلے آپریشن ایک بہت بڑی بلا سمجھی جاتی تھی۔ انور زاہدی کا افسانہ "زحال مستی" جو شمارہ اٹھانوے میں طبع ہوا ہے۔ اس پہلو پر بڑی خوبصورتی سے بات کی گئی ہے۔

> "سنا ہے آپریشن کا سنتے ہی سارے خاندان میں شور مچ گیا تھا۔ اس زمانے میں آپریشن کا ہونا آخری بات سمجھا جاتا تھا۔ ان دنوں میں بیماریاں اس قدر عام نہ تھیں۔ پھر لوگ علاج ولاج کے چکر میں نہیں پڑتے تھے۔ بڑا ہوا تو کسی سیانے سے دم درود کروالیا یا حکیم سے شربت خمیرہ اور معجون وغیرہ لے لی۔۔۔ اللہ اللہ اور خیر صلے۔"(۲۰)

اقتباس میں واضح طور پر پرانی تہذیب کے خصائص بیان کئے ہیں۔ اس افسانے میں پرانی مگر سادہ تہذیب کو عمدہ الفاظ میں یاد کیا گیا ہے۔ آج جب حالات بہت دگرگوں ہو چکے ہیں۔ نفسانفسی نے ہر طرف ڈیرے ڈال لئے ہیں۔ ڈاکٹر علاج کے نام پر غریب عوام کا خون چوستے ہیں۔ آج کا طبیب ڈاکٹر ہی ہے انسان تو بہت کم ہیں۔ اسی طرح آج کے دور میں بیماریوں کی کثرت ہے۔ آپریشن تو اب بہت معمولی کام ہے۔ لیکن کچھ عرصہ پہلے آپریشن ایک بڑی آفت کا نام ہوا کرتا تھا لوگ اس کا نام سن کر گھبراتے تھے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ بیماریوں میں اضافہ ہوتا گیا جبکہ پرانے وقتوں میں لوگ علاج معالجے کی طرف کم ہی رخ کرتے تھے۔ سادگی سے علاج کرتے تھے اور شفا بھی مل جاتی تھی۔ آج انسان نے اپنے لئے جتنی بھی سہولیات تلاش کی ہیں زندگی جس قدر سہل بنائی ہے لوگوں کی اوسط عمر اسی نسبت سے کم ہوئی ہے۔ اس عہد کے فرد آج کے پیچیدہ اور نفسیاتی مسائل سے بہت دور رہتے ہوئے زندگی بسر کرتے تھے۔ آج فرد طرح طرح کے مسائل میں الجھا ہوا نظر آتا ہے۔ زمانہ نہیں بدلا بلکہ ہمارے عہد کے لوگ بدل چکے ہیں۔ زمانہ اگر بدلہ ہوتا تو وہی صبح اور شام آج نہ ہوتے۔ اس کے متعلق صبا اکرام نے لکھا ہے:

> "ہر چند آدمی کی زندگی اس وقت ایک جیسی صبحوں اور شاموں سے ہو کر گزر رہی تھی مگر سماجی اور معاشی مسائل اس وقت اتنے پیچیدہ نہیں ہوتے تھے اور نہ ہر وقت اس کے سر پر خود اپنے ہاتھوں بڑھائی ہوئی ضرورتوں کا بوجھ رکھا ہوتا تھا۔ لہذا کم از کم اپنے فرصت کے اوقات کو وہ اپنے یاروں، دوستوں سے خوش گپیوں یا رشتہ داروں سے ملنے ملانے یا پھر بیوی بچوں کے ساتھ سیر سپاٹے میں گزار کر اپنی شامل ہونے سے بچالیتا

تھا۔۔۔ جدید افسانہ نگاروں نے اس کیفیت کو شدت سے محسوس کیا ہے۔"(۲۱)

اس اقتباس میں بھی ماضی کو یاد کر کے دور حاضر میں انسان کو در پیش مسائل کا بھرپور اظہار کیا گیا ہے۔ اگرچہ قدیم انسان کی زندگی میں وقت آج ہی کی طرح تھا لیکن اس عہد کا فرد فرصت کے لمحات سے پوری طرح لطف اندوز ہوتا تھا۔ آج کے فرد جو کہ گلوبل ویلج کا حصہ ہے اس کی زندگی قدم قدم پر مشکلات کا شکار ہے۔ فرد نے آسائش کو اپنی زندگی کا حصہ بنالیا ہے جس کی وجہ سے ضرورتوں کے پہاڑ منہ کھولے ہر وقت معاصر انسان کو ڈراتے ہیں۔ ان تمام معاشی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے معاصر انسان صبح سے شام تک سرگرداں رہتا ہے بلکہ آرام کرنے اور ستانے کا وقت آج کے انسان کے پاس بالکل نہیں ہے۔ جب موبائل ایجاد ہوا ہے اس نے فرصت کے لمحات چھین لئے ہیں۔ بلکہ اب دوستوں یاروں سے بالمشافہ ملاقات کی بجائے فون پر ہی بات کر لی جاتی ہے۔ مشاعروں والا زمانہ گیا اب شعراء حضرات بھی زیادہ تر شاعری سوشل میڈیا کے ذریعے ہی عوام تک پہنچاتے ہیں۔ اب فرد معاشی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے دو دو نوکریاں کرتا ہے جس سے اس کے اعضاء جلدی تھک جاتے ہیں۔ آج کے دور کا ایک اور بڑا مسئلہ ہمارے سامنے آیا ہے کہ انسان کتاب سے دور ہوتا جارہا ہے۔ اس جہت کی طرف آج کے افسانہ نگار نے اشارے کئے ہیں:

"مطالعے کا وہ بچپن سے شیدائی تھا۔ اس کے بچپن کے زمانے میں ٹی وی ابھی نیا نیا آیا تھا اور بہت کم گھرانوں میں میسر تھا اس لئے مطالعہ اس زمانے کی سب سے بڑی اور سستی تفریح تھا۔ بچوں کی کہانیوں اور رسائل ہی سے اس نے مطالعے کا آغاز کیا۔"(۲۲)

مندرجہ بالا اقتباس میں بھی افسانہ نگار ہمارے عہد کے بدلتے ہوئے رجحان کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ افسانہ نگار نے تو صرف ٹی وی کو کتاب کش قرار دیا ہے۔ اب تو اتنی ٹیکنالوجی ایجاد ہو چکی ہے کہ ٹی وی بھی ماضی کی یادگار معلوم ہوتی ہے۔ جتنا انسان نے سائنسی ترقی کر کے سہولت کے لئے اشیاء ایجاد کی ہیں وہ مثبت سے زیادہ منفی اثرات انسانی زاندگی پر مرتب کر رہی ہیں۔ جیسا کہ موبائل نے انسان کی زندگی پر ان مٹ نقوش مرتب کئے ہیں۔ عالمگیریت کا ایک سب سے بڑا نمائندہ موبائل ہے جس کے ذریعے ہماری مقامی اقدار معدوم ہو رہی ہیں جبکہ مغربی تہذیب غالب آتی جارہی ہے۔

شہروں کے پھیلنے اور دیہات سے نقل مکانی نے بھی حالات کو بہت حد تک تبدیل کر دیا ہے۔ صبا اکرام نے جدید تہذیب کے اس مسئلے کو بھی واشگاف الفاظ میں بیان کیا ہے:

> "دیہاتوں سے نقل مکانی کر کے شہروں میں آباد ہونے والوں کے درمیان آپس میں ویسا رشتہ قائم نہ ہو سکا جیسا کہ دیہاتوں میں تھا کیونکہ وہاں تو لوگ ایک دوسرے کو ان کے پرکھوں کے حوالے سے جانتے تھے اور ان کی عزت و آبرو کو اپنی عزت و آبرو سمجھتے تھے جبکہ صنعتی شہروں میں ایسا نہیں ہے۔"(۲۳)

دیہاتوں سے نقل مکانی کی صورت میں کئی نئے مسائل نے جنم لیا ہے۔ اب جب شہروں میں لوگ وارد ہوئے تو یہاں کے رواجات کے مطابق ایک کمرے والا اپنے ساتھ والے کمرے میں رہتے ہوئے فرد کو نہیں جانتا۔ گاؤں پورا ایک خاندان کی طرح ہوتا ہے۔ جہاں لوگ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں برابر کے شریک ہوتے ہیں لیکن اب گاؤں میں بھی حالات نے کروٹ لے لی ہے اور عالمگیریت کی لپیٹ نے وہاں بھی افراد کو ایک دوسرے سے بیگانہ کر دیا ہے۔ گاؤں میں رہنے والے جب اپنے آپ کو ایک خاندان سمجھتے تھے تو ایسے میں ہر فرد دوسرے عزت، آبرو، جان اور مال کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ شہر کی ہوس پرستانہ زندگی میں متذکرہ بالا ایک بھی چیز دوسروں سے محفوظ نہیں ہے۔ اب تو مفکروں، افسانہ نگاروں کے ہاں یہ سوال جنم لے رہا ہے:

> "اس وقت ہمارا سارا معاشرہ شہر اور دیہات کی آویزش سے گزر رہا ہے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ آگے چل کر وہ کیا شکل اختیار کرے گا؟ یعنی کیا دیہاتی کلچر نابود ہو جائے گا یا شہری تہذیب کی بے پناہ یلغار کے باوجود خود کو باقی رکھنے میں کامیاب ہو سکے گا۔"(۲۴)

اب یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ شہری کلچر دیہاتی کلچر پر غالب آ چکا ہے۔ شہری ہی کیا بلکہ مخصوص تہذیبیں اور ان کی ثقافت وقت کے ساتھ ساتھ معدوم ہو رہی ہیں۔ اس لئے عالمگیریت نے زندگی پوری طرح تبدیل کر دی ہے۔ اب گزرا ہوا ماضی ہمیں حسین معلوم ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ معاصر افسانہ نگاروں کے دل میں ایک خلش سی باقی ہے جو بار بار انہیں ماضی کو یاد کرنے پر اکساتی ہے۔ اس دور میں اگر انسانی زندگی میں

سہولیات کم تھیں لیکن زندگی پر سکون تھی۔ ضرورتوں کے اس قدر دیونہ تھے جنہوں نے آج معاصر انسان کو مشین بنا کر رکھ دیا ہے۔ ماضی کی اچھی اقدار کی بجائے اب مادیت پرستی نے لے لی ہے اور آج کے افسانہ نگار کو اسی کا گہرا شعور ہے۔

ii۔ دیہی معاشرت پر جدید تہذیب کے نشانات:

آج گاؤں تو برائے نام دیہات رہ گئے ہیں وہاں بھی تمام جدید سہولیات میسر ہیں۔ سائنسی ترقی نے گاؤں کی پر سکون فضاء کو تو بہت متاثر کیا ہے۔ وہاں پر بھی ہمیں جدید اشیاء کا استعمال نظر آتا تھا۔ پچاس کی دہائی یا اس سے قبل جو افسانہ نگار ہمارے سامنے آئے تھے انہوں نے دیہی معاشرت کے خوبصورت مرقعے پیش کئے۔ پریم چند کے اکثر افسانوں کا پس منظر دیہاتی زندگی ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں بھی پس منظر گاؤں کی پر سکون فضا ہے۔ بعد میں اس جہت پر تنقیدی و تحقیقی کام بھی ہوا۔ ڈاکٹر انور سدید نے 'اردو افسانے میں دیہات کی پیش' کے نام سے کتاب بھی لکھی۔ اس طرح اب تو اس ذیل میں بہت زیادہ کام ہو چکا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا کہ معاصر افسانہ نگار کے ہاں بھی دیہات کے وہی فطری مناظر ہمارے سامنے آتے ہیں یا ان میں تبدیلی آچکی ہے۔ یہاں گلوبل ویلج بن گئی اس دنیا نے گاؤں کی زندگی پر کیا اثرات مرتب کئے ہیں۔ دیہاتوں میں بھی ہمیں جدید سائنسی ایجادات سے فائدہ اٹھانے کی بھرپور کوشش نظر آتی ہے اس سلسلے میں پہلا افسانہ ہمارے سامنے ایوب اختر کا 'بارہ بانوے کا رحیم بخش' آتا ہے اس افسانے کا مرکزی کردار دیہات کی طرف سفر کرتا ہے۔ سرکاری کام کے پیش نظر وہ اپنے شہر سے دور کسی گاؤں میں جاتا ہے۔ اتنے دور افتادہ علاقے میں پہنچنے کے باوجود وہ اس قابل ہوتا ہے کہ پوری دنیا سے رابطہ کر سکے۔ یہی تبدیلی ہمیں گاؤں کی سطح پر نظر آتی ہے:

> "وہ ابھی اسی خیالی منظر میں محو تھا کہ فون کی گھنٹی بجی تو چونکا، اس نے فوراً ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف نایاب تھی۔ 'او یقین کرو میں تمہارے ہی بارے میں سوچ رہا تھا'۔ 'رہنے دو فون تو ہو نہیں سکا تم سے، میں اتنی دیر سے کوشش کر رہی تھی، بڑی مشکل سے نمبر ملا ہے۔"(۲۵)

اب معاصر عہد میں مواصلات کے نظام نے اس قدر ترقی کی ہے کہ موبائل کا استعمال دور افتادہ دیہاتوں میں بھی عام ہو چکا ہے۔ موبائل کیا دوسری جدید ٹیکنالوجی سے دیہاتی لوگ فائدہ اٹھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دور کے دیہات میں بیٹھا ہوا شخص انٹرنیٹ کے ذریعے پوری دنیا سے رابطے میں رہتا ہے۔ اب گاؤں برائے نام دیہات رہ گیا ہے۔ عملی طور پر وہ بھی عالمی گاؤں کا حصہ بن چکا ہے۔

اب دور دیہاتوں میں بھی مشکل حالات میں جہاز دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک امداد لے کر پہنچ جاتے ہیں۔ ناگہانی آفات کی صورت میں پاکستان میں ایسا دیکھنے میں آیا ہے:

> "ہیلی کاپٹر کو دیکھتے ہی اس نے ہاتھ ہلانا شروع کیا۔ شور مچا کر مدد مدد کی آوازیں دیں۔ اپنی شرٹ اتار کر فضا میں لہرائی مگر ہیلی کاپٹر چند لمحوں میں ہی آسمانی منظر سے غائب ہو گیا۔ کوئی آدھا دن گزر جانے کے بعد ہوائی جہاز فضا میں نمودار ہوا اور غائب ہو گیا۔"
> (۲۶)

پاکستان میں آنے والی قدرتی آفات کے نتیجے میں پوری دنیا سے امداد آئی اور ساتھ دنیا کے کونے کونے سے ہیلی کاپٹر بھی آئے۔ اب یہ دیہات میں بھی گئے۔ مندرجہ بالا اقتباس میں واضح طور پر ایک گاؤں کا نقشہ کھینچا گیا ہے جہاں پر ہمیں دیہات میں جدید مشینری نظر آتی ہے۔ ذرائع آمدورفت کی اس برق رفتار اشیاء نے دنیا کو گلوبل ویلج بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس حوالے سے نذیر تبسم رقم کرتے ہیں:

> "پوری دنیا مواصلاتی و اطلاعاتی انقلاب کی بناء پر ایک چھوٹی سی بستی کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ اس لئے پوری دنیا کی ثقافت اور تمدن بھی یکساں ہونا چاہئے۔ دنیا میں پائے جانے والی تہذیبوں کو ایک دوسرے کے قریب کر دیا جائے۔ ہر تہذیب کے ماننے والے دوسری تہذیبوں سے اچھی باتیں اخذ کریں اور انہیں اپنی زندگی میں جگہ دیں۔"(۲۷)

مواصلات اور اطلاعات میں ترقی نے پوری دنیا کی کایا پلٹ کر رکھ دی ہے۔ اب دور دراز کے علاقوں میں بھی جدید اشیاء اور جدید ٹیکنالوجی کا استعمال نظر آتا ہے۔ اب دنیا کے زیادہ تر علاقے گلوبل ویلج کا حصہ

ہیں۔ بذریعہ انٹرنیٹ یہ علاقے بھی دنیا کے ترقی یافتہ علاقوں کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ جب جو معلومات درکار ہو آسانی کے ساتھ حاصل کی جاسکتی ہیں۔ علم تک رسائی بہت آسان ہو چکی ہے اب فرد اس کا کس قدر مثبت انداز سے کام لیتا ہے یہ اس پر منحصر ہے۔ "سائنسی ترقی نے زمینی فاصلوں کو مٹا دیا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی برق رفتاری نے ذہنی اور جسمانی فاصلے کم کر دیئے ہیں۔"(۲۸) معاصر افسانہ نگار نے ان بدلتے ہوئے حالات کو اپنے افسانے میں پرونے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

معاشرتی سطح پر ہونے والی ان تبدیلیوں کا بہترین عکاس ہمارے عہد کا افسانہ ہے۔ محمد الیاس نے ان کا تذکرہ خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ محمد الیاس کا افسانہ 'خاندانی لوگ' اس حوالے سے خاصے کی چیز ہے:

> "گو کہ ہم ایک ہی شہر میں رہ رہے ہیں۔ میرے میکے اور سسرال میں ہر سہولت موجود ہے۔ ویڈیو لنک کے ذریعے بھی بات کر سکتے ہیں۔ بالکل آمنے سامنے اور ملاقات کرنے پر بھی پابندی نہیں۔"(۲۹)

اس انداز میں محمد الیاس نے جدید تہذیب کے نشانات کو اپنے افسانوں میں پرو دیا ہے۔ سوشل میڈیا اور دوسرے تمام ذرائع تک آج بہت زیادہ لوگوں کی رسائی ہے۔ یہ سہولتیں اب زیادہ تر دیہاتوں میں ہی میسر ہیں۔ لوگ براہ راست کسی بھی جگہ پر بیٹھ کر دنیا کے دوسرے کونے میں کال کر سکتے ہیں۔ بات کے ساتھ ساتھ جسمانی طور پر بھی ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں۔ معاصر افسانہ نگاروں کے ہاں اس کا گہرا شعور ملتا ہے کہ اس کے عہد میں پرانی قدریں مٹ رہی ہیں اور نئی تہذیب جنم لے رہی ہے۔ جس میں فرد کو سہولتیں تو بہت حاصل ہیں لیکن ان کے نقصانات بھی بہت ہیں بلکہ اس افسانے میں محمد الیاس نے بڑے پتے کی بات کی ہے۔ "جدید دور میں تو فون کال اور ایس ایم ایس کی بھی اہمیت ختم ہو چکی ہے۔"(۳۰)

محولہ بالا جملے سے ظاہر ہوتا ہے کہ آج سائنسی میدان میں انسان ترقی کے بڑے بڑے قدم اٹھا رہا ہے۔ گزرا ہوا کل ٹیکنالوجی کے لحاظ سے آج کے مقابلے میں ماضی بعید نظر آتا ہے۔ کوئی نئی چیز ایجاد ہونے کے بعد سائنس دان اس کو مزید بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش میں ہر وقت مصروف رہتے ہیں جس کی وجہ سے یہ تبدیلیاں بڑی تیزی کے ساتھ رونما ہو رہی ہیں۔ پرانی تہذیب کے نشانات آہستہ آہستہ مٹ رہے ہیں اور ان کی جگہ نئی تہذیب لے رہی ہے اس کے بھرپور عکاس حمید شاہد کے افسانے ہیں۔ حمید شاہد کے متعلق ڈاکٹر

نجیبہ عارف رقم کرتی ہیں:

"اکیسویں صدی کی چھوٹی قوموں کے افراد جو اپنے گردو پیش کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں اور اپنی تہذیب و ثقافت، لسانی و علاقائی شناخت، مخصوص روایات و اقدار کو ایک بے ہنگم اور بے شکل و صورت منصوبے کے بلیک ہول میں گرتے ہوئے بھی دیکھ رہے ہیں۔"(۳۱)

اس اقتباس میں ایک بڑے اہم نکتے کی طرف اشارہ موجود ہے کہ اور مقامی تہذیبیں معدوم ہوتی جا رہی ہیں۔ ان کی اقدار مٹ رہی ہیں اور ان کی جگہ نئی اقدار نے لے لی ہے۔ اس المناک صورتحال کو عصر حاضر کے افسانہ نگار نے محسوس کرتے ہوئے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ ایک زمانہ تھا مٹی کا دیا اور لکڑی سے چراغ بنا کر کام لیا جاتا تھا۔ اب شہروں میں ہی کیا دور دیہاتوں میں بھی بجلی کی سہولت میسر ہے۔ رشید مصباح نے اپنے افسانے 'خاک زادے' جو کہ ادبیات کے شمارہ نمبر ایک سو سات میں زیور طبع سے آراستہ ہوا ہے۔ اس میں الفاظ میں بدلتی ہوئی صورتحال کی عکاسی کی ہے:

"سنگلاخ پہاڑوں کے کچھ حصوں میں بجلی کے کھمبے لگ چکے ہیں اور خوشحال گھرانوں تک بجلی کی سپلائی بھی پہنچ چکی ہے۔۔۔ دریائے گومل کے اس پار والی پہاڑی پر دو ٹاور بھی تعمیر ہو چکے تھے جو اب علاقے کے بڑے حصے میں مواصلات کے نظام کو مربوط رکھنے کا کام دیتے تھے۔"(۳۲)

متذکرہ بالا اقتباس جس افسانے سے اخذ ہے اس میں بلوچستان کے دور دیہات کی عکاسی کی گئی ہے۔ وہاں پر رونما ہونے والی تبدیلیوں کا بھرپور احساس فنکار کے ہاں موجود ہے اور اس نے اس کو لفظوں کے روپ میں صفحہ قرطاس پر بکھیرا ہے۔ دور دراز دیہاتوں میں اب بجلی کی سہولت میسر ہے۔ وہاں پر مواصلات کا نظام بھی پَر پھیلا چکا ہے اور اس طرح ہر لحاظ سے دیہاتی علاقے بھی دنیا کے دوسرے کونوں سے انٹرنیٹ کے طفیل مل چکے ہیں اور یہ دنیا واقعی گلوبل ویلج نظر آتی ہے۔ اب بلوچستان کے متعلق ہی کچھ عرصہ قبل فردوس انور قاضی کی رائے تو یہ تھی:

"اگر غور کیا جائے تو ادب کے حوالے سے نہ صرف بلوچستان بلکہ قومی سطح پر بھی بعض پڑھے لکھے لوگوں کی اکثریت ایسی ہے جو قومی زندگی سے بے خبر ہے۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی کی اندھا دھند دوڑ نے اس بے خبری کو چار چاند لگانے کا کام کیا ہے۔"(۳۳)

فردوس انور قاضی نے بلوچستان کے دیہاتوں میں ہونے والی تبدیلی کی تائید کی ہے اور معاصر افسانہ نگار بھی اب اپنے آپ کو عالمی گاؤں کا حصہ تصور کرتے ہوئے عالمی موضوعات کو افسانے کا موضوع بناتے ہیں۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ "افسانہ نگار روح عصر کا ترجمان ہوتا ہے۔"(۳۴)

سماج کی سطح پر ہونے والی تمام تبدیلیوں کا اس کو بھرپور احساس ہوتا ہے پھر وہ ان تبدیلیوں کو اپنے افسانوں میں برتنے کی کوشش کرتا ہے۔ اب افسانہ نگاروں کے ہاں یہ بات نظر آتی ہے کہ شہر اور دیہات کا فرق مٹ رہا ہے شہری تہذیب دیہات پر بھی غالب آتی جارہی ہے۔

"جہاں تک اردو افسانے میں شہری زندگی کے مسائل کا تعلق ہے تو دور حاضر میں شہر اور دیہات میں تفریق دقت طلب ہے کیونکہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس دور میں آمدورفت اور ذرائع ابلاغ نے اتنی ترقی کی ہے کہ شہر اور دیہات میں حد فاضل بہت کم ہوگئی ہے۔"(۳۵)

یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ آج دیہات اور شہر کے درمیان فرق مٹ رہا ہے۔ شہری زندگی جو کہ مصنوعی ہے اس کے اثرات نے دیہاتی زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اس لئے افسانہ نگار کے لئے اب دیہات کی فطرت نگاری سے دیہی معاشرت پر جدید تہذیب کے ذریعے رونما ہونے والی تبدیلیوں کی عکاسی نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر عنایت اللہ فیضی نے بھی سکندر شاہ کے افسانوں میں ان عناصر کی کارفرمائی پر سیر حاصل بحث کی ہے:

"وہ آنکھوں سے معذور ہونے کے باوجود ٹرانسسٹر لگائے کرکٹ کمنٹری باقاعدگی کے ساتھ سنتا ہے اور سنیل گواسکر سے لے کر مارک واتک سارے کرکٹروں کا ریکارڈ اپنی یادداشتوں میں محفوظ رکھتا ہے حالانکہ اس نے گاؤں سے باہر قدم نہیں رکھا۔ ایشیا

کے ایک دشوار گزار پہاڑی علاقے میں سکندر شاہ کی کہانیاں تخلیقی سطح پر ادب میں
عالمگیریت کے دخل در معقولات یا نئے رجحانات کی نشاندہی کرتی ہیں۔"(۳۶)

آج کا انسان اگرچہ سفر نہ بھی کرے تو اس کے پاس دور دراز ملکوں کی معلومات موجود ہوتی ہیں۔ متذکرہ بالا اقتباس میں ایک کردار ہے جو کہ معذور بھی ہے لیکن وہ دوسرے ممالک کے لوگوں کو جانتا ہے اور ان کے کارناموں سے بھی آگاہ ہے۔ اس طرح افسانہ نگاروں نے گاؤں کی تہذیب پر جدید معاشرت کے اثرات کو واضح انداز میں بیان کیا ہے۔ انہوں نے دیہاتی زندگی کی سطح پر اور زندگی پر اثرات مرتب کرتی ہوئی جدید ٹیکنالوجی کے بیان سے ہاتھ نہیں کھینچا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ دیہات کی زندگی اب برائے نام دیہات رہ گئی ہے۔ آج زیادہ تر گاؤں گلوبل ویلج کا حصہ بن چکے ہیں۔ اس دعویٰ کے شواہد مندرجہ بالا بحث میں واضح طور پر نظر آتے ہیں

iii۔ مغربی کلچر کا فروغ:

معاصر افسانے میں جب عالمگیریت کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو اس کے عملی مظاہر ہمارے کلچر میں دکھائی دیتے ہیں۔ پہلے تذکرہ ہو چکا ہے عالمگیریت کے پردے میں دراصل امریکیت اور مغربیت کو فروغ دینے کے لئے عملی اقدامات کئے جارہے ہیں۔ متذکرہ بالا تہذیبوں کو پھیلانے کے لئے تمام ذرائع کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ ان تہذیبوں کا اثر سب سے زیادہ عورت نے قبول کیا ہے اور ہمارے لئے مغربی کلچر کے عملی مظاہر ان کے ہاں دکھائی دیتے ہیں۔ 'ماڈرن' ہونے کے نام پر جو کچھ کیا جارہا ہے وہ دراصل اغیار کے جال ہیں جس میں ہم بری طرح پھنس چکے ہیں۔ خالد فتح محمد ہمارے عہد کے ایک بڑے تخلیق کار ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانے 'بے جان و جاندار' میں اسی مغرب پرستی کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے۔ ":او سمجھی! دیکھیں، میں ایک ماڈرن عورت ہوں اور مجھے ہر چیز ماڈرن چاہئے۔۔۔ خاوند، رہائش اور زندگی۔(۳۷)

اس افسانے میں کس طرح مغرب پرستی کو خوبصورت انداز میں دکھایا گیا ہے۔ یورپ سے آنے والے نئے افکار کو ہمارے لوگ ماڈرن سمجھ کر اپنا لیتے ہیں لیکن ان کے نتائج مثبت سے زیادہ منفی مرتب ہوتے ہیں۔ مشرق کی عورت کی زندگی بھی پوری طرح بدل چکی ہے۔ اب مشرقی عورت نے بھی مغربی عورت کی طرز پر زندگی گزارنی شروع کر دی ہے۔ اس بارے میں ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

"تقسیم کے بعد ہمارے یہاں بھی حالات ایسی ہی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ معاشی بدحالی، مصارفِ زیست میں اضافہ اور موزوں رشتوں کی کمیابی کے باعث لڑکیاں اب تعلیم سے زیور کا کام نہیں لے رہیں بلکہ استانیوں، نرسوں جیسے زنانہ پیشوں سے ہٹ کر زیادہ تنخواہوں کے لئے بینکوں، فرموں، دفتروں اور دکانوں میں پہنچ چکی ہیں۔ اب وہ برقعہ میں بند چلنا پھرنا پسند نہیں کرتیں۔"(۳۸)

ڈاکٹر سلیم اختر کی یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ آج عورت کا چراغ خانہ والی روایت دم توڑ چکی ہے۔ اب مشرقی عورت نے بھی اپنے بازو میں قوت دکھاتے ہوئے زندگی کے تمام شعبوں میں حصہ لیا ہے۔ دن بدن بڑھتی ہوئی مہنگائی اور معاشی ضرورتوں میں ہوشربا اضافے نے معاصر عورتوں پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں۔ اب عورتوں کے اندر پردے کا رجحان بھی کم ہو رہا ہے۔ مغرب سے آنے والے فیشن کے بے مہار طوفان نے عورتوں کو اپنے سحر میں کڑ لیا ہے۔ اس لئے اب وہ پردے کو خاطر میں نہیں لاتیں بلکہ کھلے بالوں اور چست لباس پہن کر چلنے پھرنے کو معیوب نہیں سمجھا جاتا ہے۔ دوسری بات جو ہمارے نوجوان طبقے میں بھی مغرب پرستی فروغ پا رہی ہے وہ غیر ممالک میں جا کر کمانے اور وہاں رہائش اختیار کرنے پر کمربستہ نظر آتے ہیں۔ اس حوالے سے انور زاہدی کا افسانہ 'پرانے کاغذوں میں' ایک اہم افسانہ ہے۔

"شادی کے کچھ ماہ سہیل اپنی بیوی کے ساتھ میرے پاس رہا پھر اسے آسٹریلیا میں ملازمت مل گئی۔ اب وہیں کا مستقل رہائشی ہو گیا ہے۔ نبیل اپنی ڈگری لیتے ہی کینیڈا کی امیگریشن میں لگ گیا تھا اور اب نبیل کو بھی گئے ہوئے کئی ماہ ہونے کو ہیں۔"(۳۹)

معاصر افسانہ نگار نے ہمارے عہد کے نوجوان کے اس رجحان کو بھی اپنے افسانوں میں بیان کیا ہے۔ آج کا نوجوان اچھی اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی بعد زیادہ پیسے کمانے کے لئے مغربی ممالک کا رخ کرتا ہے چلو وہاں پر ملازمت کے سلسلے میں جانا عیب نہیں لیکن وہاں جا کر مستقل سکونت اختیار کرنا کوئی قابل ستائش عمل نہیں ہے۔ انور زاہدی نے اپنے متذکرہ بالا افسانے میں نوجوان کی مغربی پرستی کو واضح انداز میں بیان کیا ہے۔ ہمارے عہد کے ایک اور بڑے افسانہ نگار حسن منظر ہیں۔ جنہوں نے بیرون ممالک میں ملازمت بھی کی اور

وہاں کے حالات کو پوری طرح سمجھ کر بیان بھی کیا۔ ان کے متعلق ڈاکٹر انوار احمد لکھتے ہیں:

"انہوں نے دنیا کے کئی ملک اور ان کے لوگوں کو سیاح کی نظر سے نہیں دیکھا بلکہ انہی کے بیچ بسنے والے ایک ذہنی معالج اور ان کے خوش خیال ساتھی کی طرح محسوس کیا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے پاس تفاصیل اور بیانات وافر ہیں۔"(۴۰)

مغرب میں جنسی و جسمانی اختلاط کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں اور آئے روز کچھ نیا دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ وہاں پر ایک عورت کئی مردوں سے بیک وقت رشتہ رکھے ہوئے ہوتی ہے اور ایک مرد بھی کئی عورتوں کے ساتھ عشق کا دم بھرتا ہے۔ عشق کے نام پر یہ سب اقدام دراصل ہوس ہیں۔ مغرب کی دیکھا دیکھی یہ رجحان ہم میں بھی فروغ پا چکا ہے۔ خالد فتح محمد نے اپنے افسانے 'دل کو دل سے راہ' میں کچھ ایسی ہی صورتحال کی عکاسی کی ہے:

"امی نے میرے ابو کے ساتھ زندگی گزارنا شروع کر دی لیکن تمہارے والد کے ساتھ تعلق ختم نہیں کیا۔ امی کے دو خاوند تھے جن کے ساتھ وہ رشتہ رکھے ہوئے تھیں۔ تمہارے ڈیڈی کے ساتھ انہیں محبت تھی اور میرے والد کے ساتھ ہمدردی اور وہ دونوں ایک عرصے تک ان کا حق دیتیں رہیں۔"(۴۱)

اس افسانے میں ہمارے معاشرے میں بڑھتے ہوئے مغربی رجحان کو تلخ الفاظ میں ایک نوجوان لڑکی کی زبان سے بیان کیا گیا ہے۔ منکوحہ عورت بیک وقت دو مردوں سے تعلقات استوار کئے ہوئے ہے جبکہ مشرقی تہذیب کا سب سے بڑا اثاثہ عورت کی شرم اور حیا ہوا کرتا تھا لیکن یہاں افسانے کے مطابق وہ حیا اور عفت اب برائے نام بھی باقی نہیں ہے۔ یہ تلخ حقیقت ہے اس سے انکار کی جرأت نہیں کی جاسکتی۔ ویسے بھی عالمگیریت کے نام پر جو کچھ کیا جارہا ہے وہ مغربیت ہی ہے۔ یہ بات تو عام فہم ہے یہ مغربی تہذیب کا پیدا کیا ہوا نظریہ ہے۔ کیونکہ "عالمگیریت کے حوالے سے سے جس تہذیب کا نقشہ ابھارا جارہا ہے اس میں مغربی تہذیب نمایاں ہے۔"(۴۲)

اس بات میں شک نہیں ہے کہ مغربیت ہی کو عالمگیریت کے ذریعے پھیلایا جارہا ہے۔ مغربی تہذیب

خوب پھل پھول رہی ہے۔ اپنی چکاچوند اور مصنوعی ہیت میں اس تہذیب نے مشرقی تہذیب کو بہت متاثر کیا ہے۔ معاصر نوجوان جب سکول کی دہلیز پار کر کے کالج کی زندگی میں قدم رکھتا ہے تو وہ یکدم تبدیل ہو جاتا ہے۔ اکثر نوجوان مغرب پرستی اور فیشن پرستی کے گرویدہ نظر آتے ہیں اور وہ درسگاہوں میں جا کر اس کا عملی مظاہرہ کرتے ہیں۔ حسن منظر نے اپنے افسانے 'ادھ کھلے پھولوں کا زمانہ' میں اس رجحان کی عمدہ تصویر پیش کی ہے۔ " وہ لڑکا سگریٹ کے پیکٹ اور کھٹاک سے کھلنے والے سگریٹ لائٹر کو ساتھ لئے کالج کی دنیا میں داخل ہوا تھا۔ جاڑوں میں ان میں رولی فلیکس کیمرے کا اضافہ ہو گیا۔"(۴۳)

اب نوجوان کالج میں جا کر جو زندگی اختیار کرتے ہیں وہ سراسر مشرقی اقدار کے خلاف ہے۔ مغرب کی زندگی نے نوجوانوں کو اپنے سحر میں جکڑ لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محققین نے عالمگیریت کو امریکیت کا لقب دیا ہے:

> "مسلم دانشور معتبر حوالوں سے یہ ثابت کر رہے ہیں کہ عالمگیریت پوری دنیا میں سراسر امریکیت اور صیہونیت کے نفاذ کی وہ عملی کوشش ہے جس کی منصوبہ بندی کئی برسوں سے کی جا رہی ہے۔"(۴۴)

اس اقتباس سے اس دعویٰ کی تصدیق ہوتی ہے کہ عالمگیریت دراصل امریکی کلچر دنیا بھر میں پھیلانے کی ایک کوشش ہے۔ امریکہ نے غریب ممالک کو جال میں پھنسانے کے لئے عالمی بینک، آئی ایم ایف جیسے خود ساختہ جال تیار کئے ہیں۔ ان اداروں پر مکمل طور پر امریکہ کا قبضہ ہے۔ امریکہ کی حمایت ہی سے کوئی بل منظور یا مسترد ہوتا ہے۔

ایک اور رجحان جو ہمارے ہاں فروغ پا رہا ہے کہ اعلیٰ شخصیات اپنے علاج معالجے کے لئے مغربی ممالک کا رخ کرتی ہیں۔ حکمرانوں نے بالخصوص ایسا ہی وتیرہ اپنا رکھا ہے، اس بارے نجم الدین احمد نے اپنے افسانے 'حادثے سے سانحے تک' میں لکھا ہے:

> "ہاں، جب وہ لوٹا تو کتنا کمزور تھا لیکن آہستہ آہستہ اس کی صحت بحال ہونے لگی لیکن پھر بھی اس کے پاپا نے اسے کئی مرتبہ ملک سے باہر علاج کے لئے بھیجا۔ حالانکہ وہ بالکل

ٹھیک ہو چکا تھا۔"(۴۵)

ہمارے خیال میں دور حاضر میں ہمارے ہاں بھی علاج معالجے کی بہترین سہولیات میسر ہیں لیکن اس کے باوجود ہمارے حکمران اگر کسی معمولی سی بیماری میں مبتلا ہو جائیں تو وہ لندن کا رخ کرتے ہیں۔ بیوروکریسی بھی حکومتی خرچے پر باہر علاج کے بہانے جاتی ہے اور وہاں پر عیاشی کرتی ہے۔ نجم الدین نے اپنے افسانے میں ان اہم امور کی طرف قاری کو متوجہ کیا ہے۔ مغربی کلچر کے فروغ نے دراصل وہاں کی طرز زندگی اور کلچر کو ہمارے اندر بھی پختہ کر دیا ہے۔ وہاں کی طرح نفسا نفسی نے ہمارے ہاں بھی ڈیرے ڈال لئے ہیں۔ جیسے "آج کل ہمارے آزاد خیال طبقے کی عورتوں، مردوں نے شرم وحیا اتار پھینک ہے۔"(۴۶)

اس طرح یہاں پر بھی ہم ماڈرن اور آزاد خیال بننے کی کوشش میں مغربی کلچر کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ اپنی مشرقی اقدار جو کہ ہماری خوبصورت تہذیب کا حصہ ہیں ان کو فراموش کر دیتے ہیں۔ مغرب پروری میں ہم ان شرم وحیا کی دلکش اور اعلیٰ روایات کو پس پشت ڈال کر اغیار کی اقدار کو اپنا لیتے ہیں۔ اس کرب کو محسوس کیا ہے۔

iv۔ اقدر کا زوال:

عالمگیریت کو ہم نے پچھلے صفحات میں سیل بلاخیز کہا تھا اس کو سیل بلاخیز یا بتان آزری اس لئے کہا ہے کہ اس نے کئی ممالک کی تہذیبوں اور مقامی شناختوں کو معدوم کر دیا ہے۔ عالمگیریت نے امریکی تہذیب اور کلچر کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ مشرقی تہذیب کی خوبصورت روایات اور دلکش اقدار جو ہماری تہذیب کا جھومر تھیں ان کو بھی عالمگیریت نے آہستہ آہستہ مٹا دیا ہے۔ ہمارے ملک میں مغرب سے آنے والے رجحانات کو بہت فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ آج کے افسانہ نگار کو بھی اس بات کا شعور ہے جبکہ دوسری طرف تقسیم کے فوراً بعد کے افسانے سے ڈاکٹر سلیم اختر کو یہی گلہ تھا:

> "جہاں تک اقتصادی تبدیلیوں سے اقدار میں تغیرات اور ان کے اثرات کی عکاسی کا تعلق ہے تو تقسیم کے بعد افسانہ نگاروں کی اکثریت نے اس طرح خصوصی توجہ نہیں دی۔ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ مثلاً افسانہ نگاروں نے ان موضوعات کی اہمیت محسوس نہ کی یا پھر سرے سے وہ ژرف نگاہی سے محروم ہوں۔"(۴۷)

اس اقتباس میں ڈاکٹر سلیم اختر نے تقسیم کے بعد کے افسانہ نگاروں پر گہری چوٹیں کی ہیں۔ انہوں نے واضح طور پر لکھا ہے کہ متذکرہ بالا عہد کے افسانہ نگاروں کے ہاں اپنے دور کے مخصوص مسائل کا ادراک نہیں ہے اور نہ ہی مشاہدے کی صلاحیت ہے۔ اس وقت کے لئے ڈاکٹر سلیم اختر نے بجا کہا ہے لیکن آج کے افسانہ نگاروں نے تمام جہات کا احاطہ کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اب ایسے افسانے کم سامنے آتے ہیں جو ذہن پر اپنے نقش چھوڑ جائیں۔ لیکن امین الدین کا افسانہ 'چار کا ٹولہ' جو شمارہ سو میں شائع ہوا بہت عمدہ افسانہ ہے۔ یہاں جو افسر شاہی کا رواج بہت زیادہ ہے۔ وہ دراصل مغرب ہی کی دین ہے۔ اسلامی لحاظ سے تو افسر قوم کا خادم ہے لیکن ہمارے آفیسر تمام اقدار کو بالائے طاق رکھتے ہوئے یہ روش اختیار کئے ہوئے ہیں:

> "اس کے بعد اس نے وہی کیا جو چیئرمین نے چاہا۔ چند مخصوص منظور نظر ٹھیکیداروں کی مسلسل ادائیگیاں اور دیگر کی سائٹ چیکنگ کے بہانے ادائیگیاں رکنے لگیں۔ حکومت کے نوٹیفکیشن کے باوجود خفیہ اکاؤنٹ کھولا گیا جہاں سارے فنڈ ٹرانسفر کر دیئے جاتے۔"(۴۸)

متذکرہ بالا افسانے میں محمد امین الدین نے ہمارے عہد کی ایک اہم تصویر پیش کی ہے۔ خلوص اور خدمت کے جذبے جیسی صفات کو ہم نے فراموش کر دیا ہے۔ ان کی جگہ لالچ، ہوس اور مادیت پرستی نے ہمیں جکڑ لیا ہے۔ اس افسانے میں ایک کردار جواد احمد ہے اس کو فراڈ اور دوسرے منفی کاموں میں بڑی مہارت حاصل ہے۔ وہ محکمہ تعمیرات میں ملازم ہے۔ دن بھر اپنے دفتر سے غائب رہتا ہے لوگ انتظار کر کر کے تھک جاتے ہیں پھر جب واپس چلے جاتے ہیں تو وہ بھی اپنے دفتر آجاتا ہے۔ چیئرمین کے کمرے میں بیٹھ کر اس کی مرضی سے چیک بنا کر اپنے منظور نظر لوگوں کو دیئے جاتے تھے۔ جبکہ حقداروں کے کام کو مسلسل التواء میں ڈالا جارہا تھا۔ یہ افسر شاہی دراصل مغرب ہی کی دین ہے۔ جس نے ہمارے معاشرے کی صالح اقدار کو دیمک کی طرح چاٹنا شروع کر دیا ہے۔ معاصر افسانہ نگار کے ہاں یہ موضوعات ہمیں کثرت سے ملتے ہیں۔ اقدار کے زوال کے بارے میں صبا اکرام نے لکھا ہے:

> "صنعتی ترقی کے ساتھ مادیت پرستی کی جڑیں بھی مضبوط ہوتی گئیں اور آدمی ہوس زر

میں مبتلا ہو کر اس پستی پر آ گیا، جہاں پہنچ کر جھوٹ، فریب، ہیرا پھیری اور بدکاری کوئی برائی، برائی نہیں رہ جاتی بلکہ حصول زر کی راہ میں کارآمد حربہ ثابت ہوتی ہے۔"
(۴۹)

اب ہمارے ہاں بھی حصول زر لوگوں کا سب سے بڑا مطمع نظر ہے۔ یہی وہ رجحان ہے جس پر معاصر افسانہ نگار نے روشنی ڈالی ہے۔ دراصل مغرب کی صنعتی ترقی کے بعد حالات نے کروٹ لی ہے اور زر پرستی افراد کے اندر سرایت کر گئی ہے۔ پیسے کے حصول کے لئے لوگ اقدار، اخلاقیات کو صرف نظر کرتے ہوئے پیسہ حاصل کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ اس لئے یہ کہنا بجا ہے کہ لوگوں کے اندر اب برائی کو برائی نہ سمجھنے کے احساس نے ایک المناک صورتحال کو جنم دیا ہے۔

ایک اور رجحان مغرب کی دین ہے جس نے ہماری مشرقی تہذیب کی بنیادوں کو ہلا دیا ہے۔ مغرب میں والدین جب بوڑھے ہو جائیں تو ان کی خدمت کرنے کی بجائے یا خود ان کی نگہداشت کرنے کے ان کو اولڈ ہاوسز میں بھیجا جاتا ہے۔ الطاف فاطمہ کا افسانہ 'مسز ین ہیروز سکول' ہمارے معاشرے میں رجحان پاتے ہوئے اقدامات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

"وہ یہ کہ اب ان کو اولڈ ہاؤس میں داخل کروادیں۔ انہوں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا تھا جیسے یہ انہیں بری لگی ہو۔ اولڈ ہاؤس۔۔۔ اونو۔۔۔ ہوریبل پلیس (خوفناک جگہ) وہاں کے رہنے والے دیکھنے میں تو زندہ ہوتے ہیں مگر وہ جذباتی اور نفسیاتی طور پر مر چکے ہوتے ہیں۔"(۵۰)

اب اس المناک صورتحال نے جنم لے لیا ہے والدین جو اپنی اولاد کو جوان کرتے ہیں لیکن اولاد جب اپنے پاؤں پر کھڑی ہوتی ہے، والدین کی خدمت کرنے کا وقت آتا ہے تو وہ ان کی خود خدمت کرنے کی بجائے اولڈ ہاؤس میں چھوڑ آتے ہیں۔ اب وہاں پر والدین شدید کرب کی حالت میں زندگی بسر کرتے ہیں اور مختلف لوگوں کی ہمدردی بھری نظریں انہیں اور بھی جذباتی اور نفسیاتی طور پر مار دیتی ہیں۔ یہ حالات دراصل اکیسویں صدی کی پیداوار ہیں:

"بیسویں صدی سے اکیسویں صدی کے سفر میں جس انداز سے انسانی قدروں اور تہذیبوں کو شکست ہوئی ہے، وہ ایک ایسا المیہ ہے جس نے تاریخ کے صفحات سیاہ کر دیئے ہیں۔"(۵۱)

نفسا نفسی کے اس عالم میں اب اولاد نے والدین کو بھی بوجھ تصور کر لیا ہے اور ان کی خدمت خود کرنے کی بجائے ان کو حکومت کے قائم کردہ اولڈ ہاؤسز میں چھوڑ دیا جاتا ہے جہاں وہ قابل رحم زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہی اقدار زوال عالمگیریت کی دین ہے۔ کسی زمانے میں بچوں کے رشتے والدین خود کرواتے تھے اب یہاں بھی صورتحال پوری طرح بدل چکی ہے۔ خالد فتح محمد کا افسانہ 'دل کو دل سے راہ' اس حوالے سے اہم ہے۔

"پھر اپنے ڈیڈی کو بھیجو یا خود بات کرو، ابھی نہیں!، میری آواز کمزور تھی۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ بھی آیا، روبینہ نے شاید فیصلہ کرنے کی طاقت ختم کر دی تھی۔ 'ابھی کیوں نہیں'۔ اس نے اپنا دوپٹہ درست کیا۔ 'جب وقت آیا تو سب ہو جائے گا'۔ میں نے اسے اٹھنے سے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔"(۵۲)

اکثر اوقات ہمارے عہد کی نسل کے فیصلے وقت گزرنے کے ساتھ منفی نتائج لے کر آتے ہیں۔ ٹیکنالوجی کی برق رفتار ترقی نے مثبت اقدار کو گرہن لگا دیا ہے۔ اس افسانے میں بھی بڑی المناک تصویریں موجود ہیں۔ روبینہ ایک لڑکی ہے جو ایک لڑکے سے محبت کر بیٹھتی ہے۔ پھر وہ جسمانی طور پر بھی نزدیک آ جاتے ہیں۔ اپنے افعال کو معیوب نہیں سمجھتے۔ لڑکا شادی سے کتراتا ہے اور آخر کار پھر لڑکی ہی کہتی ہے کہ والدین سے شادی کی بات کرو لیکن لڑکا اب بھی کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا۔ معاصر افسانہ نگار نے ژرف نگاہی کا ثبوت دیتے ہوئے بڑے اہم موضوع پر افسانہ تخلیق کیا ہے۔

نوجوان نسل اب گمراہ ہوتی جا رہی ہے۔ ان میں سے کچھ لوگ تو جرائم کے پیشوں سے وابستہ ہو جاتے ہیں ان کو اقدار نام کی کوئی چیز کی خبر نہیں ہوتی وہ تو بس حصول زر اور فیشن سمجھ کر اپنا کام کرتے ہیں۔ محمد عباس نے اپنے افسانے میں اس جہت پر روشنی ڈالی ہے:

"اب میرے ہاتھ میں پسٹل تھا اور تین چار میرے ساتھ ہوتے تھے۔ لوگوں کو دھمکا کر، رعب ڈال کر، اپنے مالکوں کے۔۔۔ ان کی پشت پناہی پر ڈکیتی کر لینا، کسی ناپسندیدہ آدمی کو اٹھا لینا، پسلیاں توڑ دینا، کسی نامعلوم افراد کی فائرنگ سے جاں بحق کروانا، ہمارے روزمرہ کے کام ٹھہرے تھے۔"(۵۳)

نوجوان نسل میں غنڈہ گردی کا رجحان بہت فروغ پا رہا ہے۔ لوٹ مار، چوری اور شریف لوگوں اور باعزت شہریوں کی آبرو، مال اور جان پر شب خون مارنا ان کا وتیرہ بن چکا ہے۔ اب ہالی ووڈ اور بالی ووڈ کی فلموں کی طرز پر نوجوان نسل کے کچھ لوگ ان کو کاپی کرتے ہیں پھر وہ ایسے راستے پر چل نکلتے ہیں جہاں سے واپسی ممکن نہیں ہے:

"اس دور میں لوگ ایک دوسرے سے بہت دور ہو چکے ہیں۔ پرانے زمانے میں لوگ ایک دوسرے کو جانتے تھے ان کی عزت کی حفاظت کرتے تھے، اب تو وہ اقدار ختم ہو چکی ہیں۔" آج یہ حال ہے کہ اگر ساتھ والے مکان میں کوئی وقوعہ ہو جائے تو ہمسائے کو اس کی خبر نہیں۔"(۵۴)

اب فرد عدم تحفظ کا شکار ہے۔ دوسرے کی جان کی پرواہ اب نہیں کی جاتی۔ شہری کیا بلکہ دیہاتی زندگی میں بھی دوسرے لوگوں سے عزت اور آبرو بھی محفوظ نہیں ہے۔ یہ معاصر انسان کا المیہ ہے کہ انسان انسان کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر رہا ہے۔

پہلے بھی ذکر ہوا کہ معاصر عہد میں بچے والدین کے ساتھ لاپرواہی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اب گھر میں بھی بچے والدین کو ایک کونے میں خستہ حال کمرہ دے دیتے ہیں اور خود پر تعیش کمروں میں رہتے ہیں۔ "وہ بھی تو کاٹھ کباڑ کی حیثیت ہی رکھتا ہے۔ جتنا فائدہ اس کی اولاد اس سے اٹھا سکتی تھی اٹھا چکی۔ اب وہ ان پر بوجھ بن چکا تھا۔"(۵۵)

اب والدین کی پراہ نہیں کی جاتی۔ متذکرہ بالا افسانے "بھوت بنگلہ" میں ایسی ہی بے رحم حقیقت کی عکاسی کی گئی ہے جس میں اولاد نے اپنے والد کو کباڑ والے کمرے میں منتقل کر دیا۔ والد نے بہت محنت کر کے

اولاد کو پڑھایا اور اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا۔ لیکن اب اولاد سب کچھ فراموش کر کے اپنے انجام سے بے خبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے والدین کے ساتھ ایسا ہی سلوک روا رکھتی ہے۔ یہ صرف مغرب، مشرق ہی کا المیہ نہیں بلکہ عالمگیریت نے تمام دنیا میں اس مسئلے کو ہوا دی ہے۔

ہم نے معاشرتی زندگی میں متضاد رویے اختیار کئے ہوئے ہیں۔ ہم نے حق اور باطل میں فرق کو مٹا دیا ہے۔ سچ کی بجائے جھوٹ ہمارے ہاں فروغ پا رہا ہے۔ ایمانداری کی بجائے منافقت اپنے پر پھیلائے ہوئے نظر آتی ہے۔ اس موضوع کو بھی ہمارے افسانہ نگار نے باریک بینی سے اپنے مشاہدے میں لاتے ہوئے بیان کیا ہے۔

ڈاکٹر رشید امجد کے افسانوں میں فرد کے داخلی اور خارجی تضاد کو واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اب صفیہ عباد نے بھی اس بات کی تصدیق کی ہے:

> "معاشرتی زندگی کو ہی ہمارے متضاد رویے دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں۔ ہم جو کہتے ہیں وہ کرتے ہیں اور جو کرتے ہیں وہ بتانے سے گریزاں رہتے ہیں۔ جب معاشرے میں یہ طرز احساس رواج پا جائے تو سماج جائے پناہ نہیں رہتا، جائے عبرت بن جاتا ہے۔"(۵۶)

اب اگر غور کیا جائے تو فرد نے چہرے پر ایک اور چہرہ رکھا ہوا ہے۔ کوئی بھی انسان خالص نہیں ملتا۔ منافقت اور دوغلا پن، مصنوعی روش عام نظر آتی ہے: "جدید معاشرے میں انسانی اخلاقیات کا تصور بدلنے لگا اور ریاکاری معاشرے کی جڑوں میں سرایت کر گئی ہے۔ تمام شعبوں کا نظام تلپٹ ہے۔(۵۷)

عصر حاضر میں اخلاقیات کی تمام پرانی قدروں کو گرہن لگ چکا ہے۔ مغرب سے آنے والے نئے افکار نے زندگی کے تصورات کو مکمل طور پر بدل کر رکھ دیا ہے۔ اب ہمارے معاشرے میں مغربیت جڑوں تک سرایت کر چکی ہے۔ اس لئے اب اس کا اثر کم ہونے کی بجائے اور زیادہ ہوتا جائے گا۔

ہمارے آج کے معاشرے میں میاں بیوی کا رشتہ بھی قدرے کمزور ہو چکا ہے۔ جس کی وجہ سے طلاق کی شرح میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ ہر روز کوئی نہ کوئی ایسی ہی خبر سننے کو ملتی ہے: "آج تو کوئی خاص بات نہیں ہوئی بس فون آیا تھا کہ شبیر نے اپنی بیوی سلمیٰ کو طلاق دے دی ہے۔"(۵۸)

اس طرح افسانوں میں ہمیں کئی جگہوں پر ایسے اشارے مل جاتے ہیں جو ہمارے عہد کے معاشرتی مسائل کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

متذکرہ بالا بحث سے ہم پر واضح ہوتا ہے کہ عالمگیریت نے زندگی کی تمام اقدار کو کسی نہ کسی طرح متاثر کیا ہے۔ لوگوں کے رویوں میں پہلے سے بہت زیادہ فرق آچکا ہے۔ ہماری مشرقی تہذیب کی خوبصورت اقدار شرم اور حیا جو کہ ہماری تہذیب کا خاصا ہے وہ بھی ختم ہو چکے ہیں۔ آج انسان کی جان انسان کے ہاتھوں محفوظ نہیں۔ ایک فرد دوسرے فرد کی عزت کو تار تار کر کے خوش ہوتا ہے۔ اپنے برے کاموں کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا ہے۔ جیسے کہ یہ کوئی بہت بڑا نیکی کا کام کیا گیا ہے۔

معاشرے کی رگوں میں دوڑتے ہوئے اس خون کا احساس آج کے افسانہ نگار کو ہے اس لئے اس نے اقدار کے زوال کا نوحہ اپنے افسانوں میں واضح اور بے لاگ انداز میں پیش کیا ہے۔

v۔ جدید تہذیب کے پیدا کردہ جنسی و نفسیاتی مسائل:

علامہ اقبال جیسے مشہور شاعر، اعلیٰ فلسفی اور اصلاح کار کے ہاں مغربی تہذیب کے تمام گوشے بڑے واضح تھے۔ اس لئے انہوں نے کبھی شاخ نازک، کبھی گندے انڈوں اور کبھی بتان آزر کی اصطلاحات تراشیں تھیں۔ ان سے کچھ ہی برس پہلے اکبر الٰہ آبادی نے بھی مغربی تہذیب کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا۔ ہمارے ان بزرگوں کی تنقید مغرب بلاوجہ نہ تھی۔ آج جب ہم اکیسویں صدی کی دوسری دہائی کے آخر میں پہنچ چکے ہیں تو ہم پر بہت سی باتیں واضح ہو چکی ہیں ہمیں اپنی تہذیب کی اقدار مٹتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ آج کا افسانہ نگار بہت باشعور ہے۔ ظلم کے تمام ذرائع تک اس کی رسائی ہے۔ اس نے جنوں، پریوں اور اژدھا کھٹولے کی کہانیوں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ زندگی کی تقریباً تمام جہات پر ان کی نگاہیں موجود ہیں۔ عالمگیریت کے نام پر جو سیلاب بلاخیز مغرب نے ہم پر مسلط کیا ہے اس کے بھی کچھ لازمی نتائج نکلتے تھے جو کہ کثیر نفسیاتی مسائل اور جنسی مسائل کی صورت میں سامنے آچکے ہیں۔ جنس اور نفسیات کا ساتھ چولی دامن کا ہے۔ سلیم اختر نے بھی اپنی کتاب میں ان کو ایک ہی موضوع کے تحت رکھا ہے اور لکھا ہے: گزشتہ دو دہائیوں میں ابھرنے والے افسانہ نگاروں میں ان افسانہ نگاروں کی ایک معقول تعداد ہے جن کے ہاں جنس اور نفسیات گھلی ملی نظر آتی ہے۔[۵۹]

یہی صورتحال آج بھی نظر آتی ہے کہ افسانہ نگاروں کے ہاں نفسیات اور جنس قدم سے قدم ملا کر

چلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ نوجوانوں کے ہاں جنسی لذت حاصل کرنے کا رجحان نمایاں ہے۔ اب نوجوان نسل اپنے جذبات کا کھل کر اظہار کرتی ہے۔ ایک اور مسئلہ یہ بھی سامنے آیا ہے کہ اس عہد کا فرد اپنے جنسی جذبات کو قابو میں نہیں رکھتا بلکہ وہ اخلاقیات کی تمام حدوں کو توڑ کر انسانیت کے درجے سے نیچے گر کر حیوانی طرز کا ردعمل اختیار کرتا ہے۔ محمد الیاس کا افسانہ 'بد ذات'، اسی طرف ہماری توجہ مبذول کرواتا ہے: میری برداشت جواب دے گئی، لیکن اس کو بانہوں میں بھر لیا۔ وہ چیخ کر بولی دفع ہو جا مہاجر بد ذات، پرائی لڑکی پر یوں ہاتھ ڈالا کرتے ہیں۔[۶۰]

اس افسانے میں ایک کردار مرد اپنے جنسی جذبات کو قابو میں نہیں رکھ سکتا اور وہ اس لڑکی کا پیچھا کرنا شروع کر دیتا ہے۔ ایک دن موقع میسر آتے ہی وہ اسے چھونے کی کوشش کرتا ہے لیکن لڑکی کے ہاں کچھ شعور موجود ہے کہ یہ کام قطعی جائز نہیں۔ ہم اپنے جنسی جذبات کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایسا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اب لوگوں کی نظروں میں حیا ختم، شرم عنقا اور جنسی جذبات پر قابو کی کوئی صلاحیت دم توڑ چکی ہے۔ اس رویے کی عکاسی معاصر افسانے میں موجود ہے۔ اس کے متعلق ڈاکٹر شفیق انجم کی رائے بڑی جامع ہے:

> "جنسی افسانوں میں افسانہ نگاروں نے جنس کے آئینے میں سماج کے بیمار پہلوؤں کا عکس بھی دکھایا ہے اور زندگی کے منطقے میں نفسیاتی اور جنسی معاملات کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔"[۶۱]

'سماج کے بیمار پہلوؤں' بڑی معنی خیز ترکیب ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ جنس اگر ایک اہمیت کا حامل جذبہ تھا لیکن اس کو منفی انداز سے استعمال کرنے کی نہ ہماری تہذیب اجازت دیتی ہے اور نہ ہی اخلاقیات، پھر اب ہمارے سماج میں جنسی تسکین کے لئے سب ناجائز ذرائع کا استعمال کیا جاتا ہے اور ساتھ انسانیت کو پاؤں تلے روند دیا جاتا ہے۔ ایسے کئی واقعات میڈیا پر آئے روز دیکھنے کو ملتے ہیں۔

معاصر عہد کا ایک اور نفسیاتی مسئلہ یہ ہے کہ جدید ٹیکنالوجی کی ایجاد نے نوجوانوں اور بچوں کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں۔ موبائل فون کا کثرت سے استعمال اور بے شمار قسم کے کاموں میں آج کا

نوجوان اس قدر کھو چکا ہے کہ وہ اصل مقصد سے بہت دور ہوتا جا رہا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی نے فرد کو فرد سے بے گانہ کر دیا ہے۔ گھر میں رہنے والے بھی ایک دوسرے کو کم وقت دیتے ہیں بلکہ وہ موبائل اور لیپ ٹاپ پر کوئی نہ کوئی کام کر رہے ہوتے ہیں۔ محمد الیاس کا افسانہ 'دو ٹکیاں دی نوکری' اس حوالے سے اہم ہے:

> "آصفہ نے چند ایک بار شوہر سے فون پر بات کرتے ہوئے کہا کہ وہ اب گھر لوٹ آئے۔ دونوں بیٹے جوان ہو رہے ہیں۔ انہیں لیپ ٹاپ، ٹیبلٹ اور موبائل فون سے بڑھ کر کوئی رشتہ عزیز نہیں۔ اور یہ کمروں میں گھسے نکلنے کا نام ہی نہیں لیتے۔"(۶۲)

متذکرہ بالا اقتباس سے اس عہد کے ایک اہم نفسیاتی مسئلے کی طرف توجہ مبذول کروائی گئی ہے۔ آج کی نوجوان نسل جدید ایجادات اور ٹیکنالوجی میں اس قدر گھس گئی ہے کہ اس نے اپنے خون تک کے رشتوں کو فراموش کر دیا ہے۔ بچے جسمانی طور پر تو گھر میں ہوتے ہیں لیکن وہ اس دوران فیس بک، میسنجر اور واٹس ایپ پر ہوتے ہیں۔ اب تو لایعنی اقسام کی ایپس آ چکی ہیں جن پر آپ کو اخلاقیات کی تمام دھجیاں اڑتی ہوئی نظر آئیں گی۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ بڑے کوئی بات کر رہے ہوتے ہیں لیکن نوجوان کی توجہ صرف موبائل پر ہوتی ہے۔ والدین بچوں سے بات کرنے کے لئے ترس جاتے ہیں۔ بچوں کو ان جدید آلات سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ وجہ یہ ہے کہ ان آلات نے ہمیں نفسیاتی طور پر جکڑ لیا ہے اور ہم ان کے سحر سے باہر نہیں نکل سکتے۔ دوسری طرف افسانہ نگاروں کے ساتھ ساتھ معاصر نقادوں نے بھی اس جہت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

> "موبائل فون اور ٹی وی کا غلط استعمال جیسی ہیجان انگیزی، منشیات کی سوداے بازی، بے حیائی اور حرام کاری کی طرف بڑھتے ہوئے قدم، نمود و نمائش اور حرام خوری ایسے موضوعات ہمارے افسانہ نگار اپنی کہانیوں میں بڑی شدت اور حقیقت کے ساتھ برت رہے ہیں۔"(۶۳)

موبائل فون نے مرد اور عورت کے درمیان میں فاصلوں کو تقریباً مٹا کر رکھ دیا ہے۔ موبائل فون اور ٹی وی اپنے زمانے کی اہم ایجادات ہیں۔ ان سے جہاں انسانی زندگی کو بے شمار فوائد حاصل ہوتے ہیں وہاں نقصانات کا شمار نہیں ہے۔ اس بات میں قطعی شک نہیں کہ ان کے بغیر انسانی زندگی چل نہیں سکتی تھی۔ آخر

اس دور میں بھی لوگ خوش رہتے تھے جب یہ آلات نہ تھے۔ اس کے آنے کے بعد عجیب طرح کی صورتحال نے جنم لیا ہے۔ نوجوان اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ پاتے اور یہ صورتحال جنم لیتی ہے:

> "جب سے ہم نے موبائل پر جنسی chat شروع کی تھی یہ ہماری اکیلے میں ہونے والی پہلی ملاقات تھی۔ اس کے تمام فقرے میرے ذہن میں گھوم گئے۔۔۔ میں اپنے کمرے کی طرف چل پڑا اور وہ میرے پیچھے آ گئی۔۔۔ اس دوپہر وہ سب دہرایا گیا جو لفظوں کے ذریعے سکرین پر لکھتے تھے۔"(۶۴)

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ خالد فتح محمد نے اپنے متذکرہ بالا افسانے میں ہمارے سماج کی بے رحم تصویر پیش کی ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے اور ایک بڑی بیماری ہے جو مغرب سے آنے والی ایجادات کے طفیل ہمارے معاشرے میں سرایت کر چکی ہے اور ہم نے اس کو اپنے خیالات پر اس قدر سوار کر لیا ہے کہ اب عورت اور مرد کا ملنا جلنا ایک عام سی بات معلوم ہوتی ہے۔ پھر اس اختلاط کو عیب بھی نہیں سمجھا جاتا ہے۔ اس افسانے میں ہماری توجہ اس اہم مسئلہ کی طرف دلائی گئی ہے کہ نوجوان نسل اپنے جنسی جذبات کو قابو میں نہیں رکھ پاتی اور اس بیماری میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ ہمارے عہد کے اس طبقے کی اتنی بھرپور عکاسی خالد فتح محمد کا کمال ہے۔

دوسری طرف اشیاء کی ایجادات کے بعد اس کی تشہیر کے لئے جس انداز میں مہم چلائی جاتی ہے وہ قابل مذمت ہے: "اب اشیاء پیدا کر کے اس کی فروخت کے لئے تشہیری مہم چلائی جاتی ہے اور صارف کی نفسیات اس مہم میں حدف بنائی جاتی ہے۔"(۶۵)

سائنسی ایجادات نے انسانی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں۔ کمپنیاں نیم عریاں خواتین کے ذریعے اپنی اشیاء کی تشہیر کرتی ہیں جس سے افراد کی نفسیات پر گہرا اثر مرتب ہوتا ہے۔ ایک اور بات مشاہدے میں آئی ہے کہ معاصر افسانہ نگار نے اس موضوع پر کھل کر اظہار کیا ہے کسی بھی جگہ لگی لپٹی بات نہیں کی۔ بغیر شادی اور نکاح کے مرد اور عورت کا اختلاط اس نسل کا المیہ ہے۔ اس اقتباس سے کتنی تلخ حقیقت عیاں ہوتی ہے:

"رضی کچھ نہ بولی اور کانپتے ہونٹوں سے جوں کی توں سکڑی سمٹی کھڑی رہی۔ میں یہ پوچھتا ہوں کہ آدھی رات کے وقت کہاں سے آئی ہے۔۔۔ بولتی کیوں نہیں۔۔۔ بتا کہاں سے آئی ہے؟ بھائی مجھ سے بھول ہو گئی۔ میں بھٹک گئی تھی۔"(۶۶)

ہم عصر اردو افسانے میں ہمارے سماج کے اندر پائی جانے والی بیماریوں کی بے رحم انداز سے عکاسی کی گئی ہے۔ ادیب کو دراصل معاشرے کے اندر پھوڑے نظر آتے ہیں ان پر تیر برسا کر ان سے فاسد مواد نکالنے کی سعی کرتا ہے۔ متذکرہ بالا اقتباس میں واضح طور پر درج ہے کہ ہمارے معاشرے میں نوجوان نسل مغرب زدہ ہو چکی ہے۔ ان پر کسی قسم کی اسلامی اور اخلاقی تعلیمات کا اثر نہیں ہوتا۔ ہمارے عہد کی نسل اپنے جنسی جذبات کے ہاتھوں مغلوب ہو کر اپنا نقصان خود کر دیتی ہے۔

دوسری طرف آج کے فرد نے اپنی ضرورتوں کو اس قدر بڑھا دیا ہے کہ وہ ہر وقت مصروف رہتا ہے۔ آسائشات بھری زندگی نے انسان کے اخراجات میں بے پناہ اضافہ کر دیا ہے۔ جب فرد کو تمام چیزیں حاصل نہ ہوں تو وہ نفسیاتی طور پر مایوس ہو جاتا ہے اور یہ صورتحال جنم لیتی ہے۔

"دراصل میں خود اپنی توقعات پر ہی پورا نہیں اترا اور اپنے آپ سے مایوس ہو چکا ہوں، ازراہ کرم میرے بارے میں قیاس کے کنکولے نہ اڑائے جائیں۔ میں نے اس بناء پر مرنے کا فیصلہ کیا ہے کہ آج نہیں تو کل مرنا ہے۔"(۶۷)

آج کا فرد داخلی سطح پر تنہائی کا شکار ہے۔ اس نے اپنی ضرورتوں میں بے جا اضافہ کر کے اپنے لئے خود ہی مسائل کھڑے کر دیئے ہیں۔ پھر انسان اپنے لئے بڑے بڑے سپنے تراشتا ہے۔ پھر ان منزلوں کی جانب گامزن ہوا ہی چاہتا ہے کہ وہ کسی اور کام میں الجھ جاتا ہے۔ آسائش کی زندگی گزارنا آج ہر کسی کا سپنا ہے۔ کچھ اس کو پورا کر لیتے ہیں اور کچھ پورا نہیں کر سکتے جو پورا نہیں کر سکتے وہ مایوس ہو کر زندگی سے ہی تنگ آ جاتے ہیں۔ پھر متذکرہ بالا صورتحال جنم لیتی ہے۔ قناعت جو سب سے بڑی دولت ہے ہم اس کو چھوڑ چکے ہیں۔ ہم تو دن بدن اپنی زندگی کو تن آسان بنا رہے ہیں۔

اب نوجوان نسل نے عشق و محبت کے نام پر جو کھیل شروع کر دیا ہے اس کی عکاسی بھی معاصر

افسانے میں نظر آتی ہے۔ محمد ظہیر بدر کا افسانہ 'اشتباہ نظر' اس حوالے سے خاص اہمیت کا حامل ہے:

> "میری نسبت میرے کزن اشرف سے طے تھی اور میں اس سے بے پناہ پیار بھی کرتی تھی، ہم محبت میں اتنا آگے جا چکے تھے کہ میں اس سے دوری کا تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔۔۔ میں نے یہ تو بتایا ہی نہیں میری بیٹی کا باپ کون ہے۔"(۶۸)

شادی اور نکاح سے قبل مرد اور عورت کا جسمانی طور پر قریب آنا نہ دین کی رو سے جائز ہے اور نہ ہی اخلاقی نقطہ نظر سے۔ لیکن ہم اس بیماری میں پوری طرح گرفتار ہو چکے ہیں۔ اب اس سے باہر نکلنا ناممکن نظر آ رہا ہے۔ احساس گناہ دم توڑ دے تو پھر کس گناہ گناہ نظر نہیں آتا۔ آج کی نسل جب سولہویں برس میں قدم رکھتی ہے تو یہ دیکھنے کو ملتا ہیں:

> "زندگی کا سولہواں برس تھا جب پہلی بار میں اپنے اندر مستور جنس کے جذبے سے آشنا ہوا۔ جب میں اور کولن ہائیڈل پارک میں ملے تھے۔ شام گزارنے کے بعد رات بھی ہم نے اکٹھے گزاری تھی۔ پہلی دفعہ جسمانی ملاپ نے میرے اندر برقی لہریں پیدا کر دیں۔"(۶۹)

جنسی اختلاط کی مندرجہ بالا اقتباس میں جھلک واضح ہے۔ ہمارے معاشرے کی کڑوی سچائی کو آج کے افسانہ نگار نے بیان کیا ہے۔ نوجوان نسل اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ پاتی اور اس جذبے میں بہہ جاتی ہے اور اس سلسلے میں تمام دینی اور اخلاقی اقدار کو فراموش کر دیتی ہے۔ اگرچہ جنسی جذبہ ایک طاقتور جذبہ ہے۔ اسلام نے اس کو پورا کرنے کے لئے واضح اصول بنائے ہیں۔ اگر ہماری نسل کا نوجوان ان پر عمل پیرا ہو تو یقیناً جنسی آسودگی بھی پائے گا اور دنیا و آخرت میں کامیاب بھی ٹھہرے گا۔ ورنہ یہ جذبہ جس قدر طاقت ور ہے تو حالات سدھرنے کی بجائے جدید ٹیکنالوجی کی وجہ سے مزید بگڑنے کے امکانات زیادہ ہیں۔ ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش نے لکھا ہے:

> "المختصر نفسیاتی و جنسی زوایہ نگاہ، جدیدہ افسانہ نگاروں کے ہاں مخفی یا جلی انداز میں آج تک سانس لے رہا ہے۔ بلکہ سچ پوچھیے تو جب تک انسان کے اندر جذبات و احساسات کا

کھیل جاری رہے گا یہ انداز نظر مر نہیں سکتا۔ فقط اس کی لے میں کمی بیشی ہوتی رہے گی۔"(۷۰)

اس تمام بحث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ معاصر اردو افسانے پر عالمگیریت کی گہری چھاپ دکھائی دے رہی ہے۔ دیہاتی زندگی کے بدلتے تناظر، وہاں پر ہونے والی تبدیلیاں اور شہر کی مصنوعی زندگی کی چھاپ نے دیہات کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ سائنسی ایجادات نے افراد کو بہت قریب کر دیا ہے۔ وہ دنیا کے ایک کونے میں بیٹھ کر دوسرے کونے میں بات کر سکتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں۔ اس طرح دیہات بھی اب عالمی گاؤں کا حصہ بن چکے ہیں۔ دوسری طرف مغربی تہذیب کا سیلاب بلاخیز پورے جوبن پر ہے۔ اس کی وجہ ان لوگوں نے سائنسی اعتبار سے ترقی کی ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی تہذیب پوری دنیا میں عالمگیریت کے نام پر پھل پھول رہی ہے۔ ہمارے ہاں ان ایجادات کے منفی اثرات بھی دکھائی دے رہے ہیں جن پر سیر حاصل گفتگو ہوئی ہے۔ مغرب سے آنے والی اقدار کو ماڈرن کہہ کر اپنایا جارہا ہے جس سے ہماری مشرقی تہذیب کی حسین اور دلکش روایات اب طاق نسیاں بنتی جارہی ہیں۔ عالمگیریت کے نام پر ہم تن آسان ہوتے جارہے ہیں۔ سہولتوں بھری زندگی ہمارے اندر سے مجاہدانہ اور سپاہانہ شان ختم کر دے گی۔ زیادہ تر نوجوان نسل ٹیکنالوجی کا استعمال کثرت سے کرتی ہے جس کی وجہ سے بہت سے جنسی اور نفسیاتی مسائل جنم لے رہے ہیں اس کے ساتھ ساتھ ان کی صحت برے اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ عالمگیریت کے نام پر اس وقت دنیا کا جو نقشہ تشکیل دیا جارہا ہے اس کا احساس معاصر افسانہ نگار کو ہے یہی وجہ ہے جب وہ لکھنے پر بیٹھتا ہے تو اس کے سامنے اس کے دور کے بہت سے موضوعات ہوتے ہیں جن کو وہ اپنے افسانوں میں برتتا ہے۔ وہ کسی ایک ہی مقصد پر نظر مرکوز نہیں کرتا بلکہ زندگی کی کثیر الجہتی کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج کے افسانہ نگار کے ہاں موضوعات کی کثرت نے اس کو ہر قاری کے لئے دلچسپ بنا دیا۔ معاشرے کے ہر رنگ کو کسی نہ کسی صورت میں معاصر افسانہ نگار نے اپنے افسانوں میں دکھایا ہے۔ دراصل آج کا افسانہ نگار بھی اپنے آپ کو عالمی گاؤں کا حصہ سمجھتا ہے۔ ژرف نگاہی اور گہرے مشاہدے سے اپنی تحریروں کو مزید شوخ اور رنگارنگ بناتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ مبین مرزا، عالمگیریت اور ہماری عصری و ادبی تناظر (مضمون) express.pk، ۱۳ فروری، ۲۰۱۹ء، 4:00 pm

۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، مجموعہ ڈاکٹر سلیم اختر (مقالات)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۲۳۵

۳۔ عالمگیریت کیا ہے www.bbc.com/urdu ۳ فروری ۲۰۱۹ء، 4:34pm

۴۔ What is Globalization, www.piic.com/micro, (Article) 13th February, 2019 10:00 pm

۵۔ History of Globalization, (Article), internationalrelation.org, 15th February, 2019, 4:10 pm

۶۔ مرزا حامد بیگ، افسانے کا منظر نامہ، مکتبہ عالیہ، لاہور، بار اول، س ن، ص ۵۵۱

۷۔ Reference, Patricia and Hundly, The Importance of Globalization in Higher Education, www.intechoen.com, 14th February, 2019, 7:55 p

۸۔ محمد سلیم، ڈاکٹر، عالمگیریت اور جدید ادبی رجحانات (اردو نظم کے آئینے میں) (مضمون) مشمولہ: ششماہی: خیابان شعبہ اردو جامعہ پشاور، ۲۰۰۶ء، ص ۳۷

۹۔ عالمگیریت کیا ہے۔ www.bbc.com/urdu، ۱۵ فروری ۲۰۱۹ء 4:00 pm

۱۰۔ ایضاً

۱۱۔ مبین مرزا، عالمگیریت اور ہمارا عصری و ادبی تناظر، (مضمون) express.pk، ۳۱ فروری ۲۰۱۹ء، 4:00 Pm

۱۲۔ محمد حمید شاہد، اردو افسانہ، صورت و معنی، مرتبہ: یٰسین آفاقی، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۰۶ ص ۲۳۷

۱۳۔ حمیرا اشفاق، جدید اردو فکشن، عصری تقاضے اور بدلتے رجحانات، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰، ص ۳۴

۱۴۔ صاحب علی، ڈاکٹر، اردو فکشن کا مطالعہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی، اکتوبر ۲۰۰۶ء، ص ۶۷

۱۵۔ خالد فتح محمد، بے جان، جاندار، (افسانہ) مشمولہ: سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۹۷، ۲۰۱۲ء اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ص ۳۴

۱۶۔ یوسف مثالی (مرتبہ)، کلیاتِ اقبال مع فرہنگ عبداللہ اکیڈمی لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۵۲۴
۱۷۔ سید عامر سہیل، ڈاکٹر، احمد عبداللہ، عالمگیریت تناظرات و امکانات (مضمون) مطبوعہ، معیار، شمارہ ۹، ۲۰۱۳ء، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد، ص ۱۲۱
۱۸۔ زیتون بانو، ڈسٹ بن (افسانہ) مطبوعہ سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۹۸، جنوری تا مارچ ۲۰۱۸ء، ص ۲۱
۱۹۔ نذیر تبسم، ڈاکٹر، عالمگیریت اور جدید ادبی رجحانات، (مضمون) مطبوعہ، ششماہی خیابان، ص ۳۹
۲۰۔ انور زاہدی، زحال مستی (افسانہ) سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۹۸، ۲۰۱۳ء، ص ۴۰۔۳۹
۲۱۔ صبا اکرام، جدید افسانہ: چند صورتیں، زین پبلی کیشنز کراچی، بار اول، دسمبر ۲۰۰۱ء، ص ۸۵
۲۲۔ عابد میر، کتاب چور کی کہانی (افسانہ)، مطبوعہ: سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۹۸، جنوری تا مارچ ۲۰۱۳ء، ص ۸۴
۲۳۔ صبا اکرام، جدید افسانہ: چند صورتیں،، ص ۷۷
۲۴۔ سلیم آغا قزلباش، جدید اردو افسانے کے رجحانات، انجمن ترقی ادارہ پاکستان، کراچی، ۲۰۱۶ء، ص ۶۰۴
۲۵۔ ایوب اختر، بارہ بانوے کا رحیم بخش (افسانہ)، مطبوعہ، سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۷، ۲۰۱۵ء، ص ۱۱۵
۲۶۔ غلام فرید کاٹھیا، پتھر کی گرفت (افسانہ)، مطبوعہ، سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۹۷، ۲۰۱۲ء، ص ۴۷
۲۷۔ نذیر تبسم، ڈاکٹر، عالمگیریت اور جدید ادبی رجحانات (مضمون) مطبوعہ ششماہی خیابان،، ص ۴۳
۲۸۔ عشرت رحمانی، چند ہم عصر افسانہ نگار (تجزیاتی جائزے)، جاودان پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۰۶ء، ص ۹۲،
۲۹۔ محمد الیاس، خاندانی لوگ، مطبوعہ: سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۹، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۶ء، ص ۸۸۔
۳۱۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، رفتہ و آئندہ، اردو ادب کا منظر نامہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۲۵۵
۳۲۔ رشید مصباح، خاک زادے، (افسانہ) مطبوعہ: سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۷، ص ۱۰۷
۳۳۔ فردوس انور قاضی، اردو ادب کے مختلف زاویے، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۲۱۰
۳۴۔ سلیم اختر، افسانہ حقیقت سے علامت تک، مکتبہ عالیہ، لاہور، اکتوبر ۲۰۰۶، ص ۴۲
۳۵۔ صاحب علی، ڈاکٹر، اردو فکشن کا مطالعہ، ص ۴۲
۳۴۔ عنایت اللہ فیضی، ڈاکٹر، ادب اور عالمگیریت کی آنکھ مچولی، (مضمون) مطبوعہ: ششماہی خیابان،، ص ۵۶
۳۷۔ خالد فتح محمد، بے جان جاندار (افسانہ) مطبوعہ سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۹۷، ۲۰۱۲ء، ص ۳۸
۳۸۔ سلیم اختر، افسانہ حقیقت سے علامت تک، ص ۱۵
۳۹۔ انور زاہدی، پرانے کاغذوں میں، (افسانہ) مطبوعہ: سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۵، اپریل تا جون ۲۰۱۵ء،

ص ۴۰
۴۰۔ انور احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۴۹۱
۴۱۔ خالد فتح محمد، دل کو دل سے راہ (افسانہ) مطبوعہ: سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۵، اپریل تا جون ۲۰۱۵ء، ص ۲۹
۴۲۔ سید عامر سہیل، احمد عبداللہ، ڈاکٹر، عالمگیریت: تناظرات اور امکانات (مضمون) مطبوعہ: معیار، شمارہ ۹، ص ۱۲۱
۴۳۔ حسن منظر، ادھ کھلے پھولوں کا زمانہ (افسانہ)، مطبوعہ، سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۹، ۲۰۱۶ء، ص ۸۱
۴۴۔ نذیر تبسم، ڈاکٹر، عالمگیریت اور جدید ادبی رجحانات (مضمون) مطبوعہ، ششماہی خیابان،، ص ۳۹
۴۵۔ نجم الدین احمد، حادثے سے سانحے تک (افسانہ)، مطبوعہ سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۱۰، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۶ء، ص ۱۷۴
۴۶۔ محمد الیاس، قضائے معلق (افسانہ)، مطبوعہ: سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۱۳، ۲۰۱۷ء، ص ۴۴
۴۷۔ سلیم اختر، افسانہ حقیقت سے علامت تک، ص ۱۵۳
۴۸۔ محمد امین الدین، چار کاٹو لہ (افسانہ) مطبوعہ: سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۰، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۳ء، ص ۱۲۳
۴۹۔ صبا اکرام، جدید اردو افسانہ، چند صورتیں، ص ۹۳
۵۰۔ الطاف فاطمہ، مسز ین ہیروز سکول (افسانہ)، مطبوعہ: سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۰، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۳ء، ص
۵۱۔ عشرت رحمانی، چند ہمعصر افسانہ نگار، تجزیاتی مطالعہ، ص ۹۲
۵۲۔ خالد فتح محمد، دل کو دل سے راہ (افسانہ)، ص ۸۱
۵۳۔ محمد عباس، جاوید مستان (افسانہ)، مطبوعہ: سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۶، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۵ء، ص ۱۳۰
۵۴۔ سلیم آغا قزلباش، جدید اردو افسانے کے رجحانات، ص ۴۲۲
۵۵۔ احمد حسن رانجھا، ڈاکٹر، بھوت بنگلہ (افسانہ)، سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۹، ص ۱۲۴
۵۶۔ صفیہ عباد، رشید امجد کے افسانوں کا فنی و فکری مطالعہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، ص ۹۵
۵۷۔ نازیہ ملک، پاکستانی اردو افسانے میں عصری آگاہی، تجزیاتی مطالعہ، آغاز تا ۲۰۱۰ء، مقالہ برائے پی ایچ ڈی، (اردو) نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، جنوری ۲۰۱۴ء، ص ۲۴۳
۵۸۔ محمد جمیل اختر، ایک الجھی ہوئی کہانی (افسانہ) مطبوعہ: سرمایہ ادبیات، شمارہ ۱۱۳، ۲۰۱۷ء، ص ۱۰۰

۵۹۔ سلیم اختر، افسانہ حقیقت سے علامت تک، ص ۱۴۰
۶۰۔ محمد الیاس، بدذات (افسانہ)، سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۵، اپریل تا جون ۲۰۱۵ء، ص ۲۷
۶۱۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، اردو افسانہ بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۱۴۰
۶۲۔ محمد الیاس، دو ٹکیاں دی نوکری (افسانہ)، مطبوعہ سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۵، اپریل تا جون ۲۰۱۵ء، ص ۴۲
۶۳۔ شہاب ظفر اعظمی، ہم عصر افسانے کا فکری سروکار (مضمون)، مطبوعہ: اردو ریسرچ جنرل، شمارہ پانچ، اپریل ۲۰۱۵ء، ص ۲۰
۶۴۔ خالد فتح محمد، دل کو دل سے راہ (افسانہ) مطبوعہ: سہ ماہی ادبیات، شمارہ شمارہ ۱۰۵، اپریل تا جون ۲۰۱۵ء، ص ۷۷
۶۵۔ سید عامر سہیل، ڈاکٹر و احمد عبد اللہ، عالمگیریت: تناظرات و امکانات (مضمون)، مطبوعہ معیار، شمارہ ۹،، ص ۱۲۳
۶۶۔ حنیف باوا، قصہ اس بہری یخ بستہ رات کا، مطبوعہ سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۹، ۲۰۱۶ء، ص ۹۹
۶۷۔ محمد الیاس، آخری دعا (افسانہ)، مطبوعہ: سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۷، ۲۰۱۵ء، ص ۸۴
۶۸۔ محمد ظہیر بدر، اشتباہ نظر (افسانہ)، مطبوعہ: سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۷، ۲۰۱۵ء، ص ۱۲۴
۶۹۔ تیمور اختر، عالم برزخ، (افسانہ)، مطبوعہ: سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۱۰، اپریل تا جون ۲۰۱۶ء، ص ۱۸
۷۰۔ سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر، جدید افسانہ نگاری کے رجحانات، ص ۲۰۵

باب چہارم

معاصر اردو افسانہ اور تانیثیت

الف۔ تانیثیت، تعارف اور پس منظر:

لفظ 'تانیثیت' عربی زبان کا لفظ ہے۔ لغت میں اس سے مراد ہے 'مونث ہونا'، 'مونث بنانا' اور 'تذکیر کی ضد'، لیکن یہ لفظ لغوی معنوں سے بہت باہر نکل چکا ہے۔ اس کے پس پشت مغرب کی اڑھائی سو سال کی تاریخ پوشیدہ ہے۔ انگریزی میں تانیثیت کا مترادف 'Feminism' ہے۔ وہاں اس سے مراد ایک تحریک ہے جو عورتوں کے سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی حقوق کے لئے مختلف وقتوں میں ابھرتی رہی۔ ویسے لفظ Feminism کا استعمال سب سے پہلے میڈیکل کے شعبے میں ہوا۔ ۱۸۷۱ء میں یہ لفظ ایک ایسے مرد کے لیے استعمال کیا گیا جس میں کچھ نسوانی خصلتیں موجود تھیں۔ Feminism دراصل ایک ایسی تھیوری ہے جو معاشی اور سیاسی طور پر عورتوں کے لیے مردوں کے مساوی حقوق کا مطالبہ کرتی ہے۔

اردو ادب کا لفظ 'تانیثیت' ایک جامع اصطلاح کی شکل اختیار کر چکا ہے جو اپنے پیچھے معانی کی تمام وسعتوں کو رکھتا ہے۔ بعض لوگوں نے نسوانی، نسواں اور مونث جیسے الفاظ کو تانیثیت کے مترادفات کے طور پر پیش کیا ہے جو درست معلوم نہیں ہوتا۔ نسوانی، نسواں اور مونث وغیرہ الفاظ عورت کے متعلقہ امور کی طرف نشاندہی ضرور کرتے ہیں لیکن بطور تحریک جو عوامل تانیثیت کے پس پشت موجود ہیں ان کا احاطہ بالکل نہیں کرتے تانیثیت عورتوں کے حقوق کے حصول کے لیے چلائی جانے والی تحریک ہے۔ اس میں صنفی لحاظ سے عورت کو مرد کے مساویانہ درجہ دینے کی بات بھی کی جاتی ہے۔ ''تانیثی تحریک اپنی بیش تر صورتوں میں صنفی مساوات کی دعویدار رہے۔''(۱)

تانیثیت کی بہت سی تعریفیں ناقدین نے کی ہیں جن پر بحث کی جاتی ہے۔ سب سے پہلے فہمیدہ ریاض کے الفاظ میں دیکھتے ہیں کہ اس کی کیا توضیح کی گئی ہے:

''میں نے جب بھی اسے (فیمنزم کو) استعمال کیا ہے۔ یا یہ کہا ہے کہ میں 'فیمنسٹ'

ہوں تو ہر بار میرے ذہن میں اس کا یہی مطلب رہا ہے کہ عورت کے مکمل انسانی وجود کو تسلیم کیا جائے اور اس کے کسی بھی پہلو کو کچل کر نابود کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔"(۲)

یہی وجہ ہے کہ ہم تانیثیت کو صرف نسائی معنوں میں استعمال نہیں کر سکتے بلکہ یہ ایک وسیع اصطلاح ہے جو عورت کی بطورِ انسان شناخت کا مطالبہ کرتی ہے۔ یہ ایک تحریک ہے جو عورت اور مرد کے صنفی امتیاز کو مٹا کر برابری کی سطح پر رکھنے کی کوشش کا نام ہے۔ تاریخ کے اوراق کو اگر پلٹا جائے تو واضح ہو گا کہ تاریخ کے کسی نہ کسی موڑ پر عورت کے حقوق پر شب خون مارنے اور انہیں کمتر مخلوق خیال کرنے کی مثالیں ملتی ہیں۔ اس لیے ہی فہمیدہ ریاض نے کہا "کچل کر نابود کرنے کی کوشش کی جاتی رہی"۔ عورت کو دبانے اور گھر کی چاردیواری میں مقید کرنے کا تصور ہمارے معاشروں میں واضح طور پر موجود ہے۔ جان نثار مومن نے تانیثیت کی ایک جامع تعریف کی ہے:

"خواتین کی جدت پسندی اور اعتدال روی سے سیاسی ،سماجی، اخلاقی، تعلیمی اور اقتصادی لحاظ سے جنس کی تخصیص و تشخص کے برخلاف برابری قائم کرنا، ظلم و استبداد سے آزاد زندگی فراہم کرنا، انہیں انسان کی حیثیت دینا اور سماج کو متحرک کر کے رشتوں کے درمیان امتیازات بھی ختم ہو سکیں۔"(۳)

تانیثیت ایک ایسی تحریک ہے جس نے تصورات کے بہت سے بتوں کو گرا کر رکھ دیا ہے جو بھی لوگ عورت کو صنف نازک کہتے تھے ان کو بھرپور جواب دیا گیا ہے۔ عورت کو چراغ خانہ سمجھنے کے تصور کو بھی تانیثیت نے باطل ٹھہرایا ہے۔ تانیثیت نے ہر سطح پر عورت کے لئے مرد کے مساوی حقوق کا مطالبہ کیا چاہے وہ سیاسی، سماجی یا زندگی کے کسی بھی میدان سے متعلقہ ہوں۔ عورت جس کو ماضی میں کمزور سمجھ کر اس پر ظلم کیا گیا اس ظلم کا خاتمہ کرنا بھی تانیثیت کے مقاصد میں شامل تھا۔ ویسے بھی تانیثیت ہر لحاظ سے عورت کو مرد کے برابر لانا چاہتی ہے۔ " Feminism, the belief in social, economic and political equality of the sexes. "(۴)

تانیثیت جنسی لحاظ سے عورت کو مرد کے برابر کھڑا کرنا چاہتی ہے۔ جنسی اور صنفی لحاظ سے روا رکھے جانے والے فرق کو مٹا دینا چاہتی ہے۔ تانیثیت یکدم سامنے نہیں آئی بلکہ اس کے پیچھے بہت سے عوامل کار فرما ہیں اور اس کے اسباب بہت پہلے سے تیار ہو رہے تھے۔ پہلے یہ مختلف رجحانات تھے اور بعد میں تحریک کی صورت میں نمودار ہوئے۔ "مغرب میں حقوق نسواں پر مبنی ایک سیاسی اور معاشی رجحان نے بعد میں تانیثیت کی تحریک کی شکل اختیار کر لی۔"(۵)

تانیثیت کی تحریک جب شروع میں نمودار ہوئی تو اس نے مسائل بھی کھڑے کیے۔ صدیوں سے بندھے، ٹکے اصولوں پر تانیثیت نے کاری ضربیں لگائیں، جس کی وجہ سے تانیثیت جھگڑے کی بنیاد بن گئی۔ مردوں کے سوچنے سمجھنے کے انداز کو بدلا تو آگے سے سخت رد عمل میں بھی سامنے آیا:

> "انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں پورے یورپ میں تانیثیت خانگی اختلافات کو پیدا کرنے والا جذباتی مسئلہ بن گیا تھا اور عورتوں کے مسائل اور استحصال کے خلاف احتجاج کے لئے عام طور پر اس لفظ کا استعمال کیا جانے لگا۔"(۶)

دراصل جب کوئی نیا نظریہ یا تحریک اپنے پر نکالتے ہیں تو یسا رد عمل سامنے آنا ایک فطری امر ہے۔ جب آزاد خیال عورتوں نے تانیثیت کے حق میں علم اٹھایا تو ان کو گھر ہی سے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر پدری سماج میں صدیوں سے قائم روایات پر بھی کاری ضربیں لگیں تو قدامت پسند طبقے کے لئے یہ ناقابل برداشت تھا۔ ہم تانیثیت کی تعریفوں کو سمیٹنا چاہیں تو ڈاکٹر الطاف انجم کی تعریف بھی بڑی جامع ہے وہ لکھتے ہیں:

> "مجموعی طور پر تانیثیت کے دو بنیادی تصوریات ہیں۔ اول یہ کہ کائنات میں انسان کے دو طبقے ہیں ایک مرد اور دوسرا عورت۔ اول الذکر نے ہمیشہ سے ہی آخر الذکر کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا ہے۔ ان دو طبقات کے درمیان بنیادی امتیاز جنس کا ہے۔۔۔ تانیثیت کا دوسرا بنیادی تصور یہ ہے کہ صنفی اختلافات کی بنیاد پر کسی کو کمزور یا بہتر قرار نہیں دیا جا سکتا۔"(۷)

بعض دفعہ دیکھنے میں آیا ہے کہ تانیثیت کا زیادہ زور مردوں کی مخالفت کی طرف ہوتا ہے، اس شدت پسندی اور جذباتی پن کی وجہ سے مطلوبہ مقاصد حاصل نہیں ہوتے۔ تانیثیت نے اس بات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے کہ مرد ظلم کرنے والا ہے، ایسی مثالیں انفرادی ہو سکتی ہیں مجموعی طور پر نہیں کہا جا سکتا۔ تانیثیت اس بات پر بھی زور دیتی ہے کہ مرد اور عورت کا فرق جنس کا ہے نہ کہ صنفی۔ صنفی لحاظ سے عورت کو کمزور اور ناتواں سمجھا جاتا ہے یہ سراسر بدنیتی پر مبنی خیال ہے۔ صنفی لحاظ سے نہ مرد کو عورت پر اور نہ عورت کو مرد پر فوقیت دی جا سکتی ہے بلکہ دونوں کی اپنی اپنی حدود ہیں۔

اس ساری بحث اور تعریفات کی روشنی میں یہ واضح ہوتا ہے کہ تانیثیت ایک ایسی تحریک کا نام ہے جو زندگی کے تمام میدانوں میں عورت کے لیے مرد کے مساویانہ حقوق کے لیے جدوجہد کرتی ہے۔ عورت کو سماج میں کمتر اور کمزور سمجھنے والے باطل خیال کی نفی کرتی ہے۔ صدیوں سے پدری سماج کے بنائے گئے بتوں کو پاش پاش کرتی ہے۔ عورت اور مرد کو صنفی لحاظ سے برابر قرار دیتی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تانیثیت کی ضرورت کیوں پڑی۔ دراصل سیمون دی بوائر کا یہ بیان درست معلوم ہوتا ہے۔

> ”سیمون کا اصرار ہے کہ عورت پیدا نہیں ہوتی بلکہ بنا دی جاتی ہے۔ یعنی عورت اور مرد کا مجموعی نیک و شر کی خوبی یا شخصی جنسی فرق فطری بنیاد پر نہیں بلکہ اخلاق و اقدار کے شعور کی بنیاد پر پیدا ہوتا ہے۔“(۸)

یہی وجہ ہے کہ عورت کا استحصال دراصل ہمارے معاشروں کی پیداوار ہے نہ کہ یہ فطری طور پر موجود ہے۔ عورت کی اس حالت کے اسباب کچھ مذاہب نے بھی پیدا کئے ہے۔ اسلام کے علاوہ دوسرے تمام مذاہب میں عورت کو وہ مقام حاصل نہیں ہے جو اس کا بنیادی حق ہے۔ بلکہ عورت کو شر کی علامت سمجھا گیا۔ یہودیت میں عورت کو مرد کے مقابلے میں کمتر سمجھا گیا بلکہ عورت مرد کی پسلی سے اور بعد میں پیدا ہوئی ہے کہہ کر اس کے مقام کو گرانے کی کوشش بھی کی گئی۔ یہودیت میں عورت کو ازلی گناہ گار قرار دیا گیا۔ دوسری طرف عیسائیت اس سلسلے میں یہودیت سے بھی کافی آگے نکل گیا ہے۔ اس کے مطابق عورت ازلی گناہ کی طرف مائل ہے۔ اسی وجہ سے اس کے بطن سے پیدا ہونے والا انسان بھی گناہ گار ہو گا۔ ہندومت میں بھی عورت ہمیں معتوب اور ملعون نظر آتی ہے۔ ہندوؤں نے تو عورت کو برائی کا پیش خیمہ قرار دیا۔ بدھ مت میں

نروان کے لئے لازمی شرط عورت سے دوری کو قرار دیا گیا۔ اس طرح مندرجہ بالا مذاہب میں عورت کو مجبور، کمزور، برائی کی جڑ قرار دے کر اس کی اہمیت کو اور گھٹا دیا گیا جبکہ ان مذاہب کی نسبت اسلام نے عورت کے لئے بہت سے حقوق دیئے۔ عورت کو جائیداد میں حصہ دیا گیا۔ تعلیم کا حق دیا گیا۔ ماں کی صورت میں قدموں تلے جنت اور بیٹی کی صورت میں رحمت قرار دے کر اس کی اہمیت کو واضح کیا گیا۔ اسلام کے علاوہ باقی مذاہب نے عورت کے لئے مسائل کھڑے کئے۔ ان ہی مسائل کے رد عمل میں تانیثیت کی تحریک شروع ہوئی۔ مغرب میں اس تحریک نے خوب ہلچل مچائی۔ مغرب کے حوالے سے اس کو نظریاتی طور پر دنیا کے سامنے لانے والی کوششوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

تانیثیت کا آغاز فرانس سے ہوتا ہے۔ سب سے پہلے لفظ Feminism استعمال بھی فرانس میں ہوا۔ اس کے بعد بعض تخلیقات نے تانیثیت کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ اس سلسلے کی سب سے پہلی کڑی ہمارے سامنے 'A virdication of the right of women' آتی ہے۔ اس کو چارس مور کی رپورٹ کے جواب میں میری وال اسٹون کرافٹ نے تحریر کیا۔ یہ پہلی بار ۱۷۹۲ء میں منظر عام پر آئی۔ تانیثیت کی ذیل میں اس پمفلٹ کو خشت اول کہا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد امریکی صحافی مارگریٹ فلر نے 'Woman in the Ninetenth Century.' لکھی جو ۱۸۴۳ء میں منصہ شہود پر آئی۔ یہ کاوشیں ہمیں خواتین کی جانب سے نظر آتی ہیں۔ کسی مرد نے تانیثیت کی حمایت میں جو پہلی تحریر لکھی وہ جان اسٹورٹ مل کی کتاب 'The Subjection of Women' شائع ہوئی تھی۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۸۶۹ء میں سامنے آئی۔ یہ کتاب جب منصہ شہود پر آئی تو اس نے کئی گرم مباحثوں کا آغاز کیا۔ 'دی گارڈین' میں اس پر تبصرہ شائع ہوا۔

> "And yet in 1869, when Mills Essay first appeared, it prvoked impassioned debate - He was the first male philosopher to argue voiceferusly for the emancipation of women in victorian society. "(۹)

اس کتاب میں جان سٹورٹ مل نے عورتوں کے ذاتی ملکیت کے حقوق، ان کے قانونی اور سیاسی حقوق کے ساتھ ساتھ گھر سے باہر کے حقوق، مثلاً تعلیم اور روزگار وغیرہ کے حقوق کی حمایت استدلالی انداز

سے کی ہے۔ مشہور مصنفہ اور ناول نگار ورجینا وولف کی کتاب 'A room once own' جو ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی تانیثیت کے حوالے سے ایک اہم کتاب ہے۔ اس نے عورت کو عقلی، فکری اور تخلیقی سطح پر مرد کے برابر ثابت کرنے کی پوری سعی کی ہے۔ اس کے بارے میں اعجاز الرحمن کی رائے ہے:

> "وولف کے نزدیک جیسا کہ وہ خود اپنے آپ کو ثابت کر چکی ہیں مانتی ہیں کہ عورت عقل، فکری اور تخلیقی سطح پر بھی کم تر یا کمزور نہیں ہے بلکہ اس کی صلاحیتوں کو ہمیشہ جھٹلایا گیا ہے اور اسے کبھی وہ مراعات اور ماحول میسر نہیں آیا کہ وہ پورے شد و مد اور اعتماد کے ساتھ اپنے آپ کو ادب کے لئے وقف کر سکے۔ نتیجتاً بعض ادیبوں کو احتجاجاً خودکشی بھی کرنی پڑی۔"(۱۰)

ورجینا وولف کا رویہ اور انداز قدرے جارحانہ ہے۔ انہوں نے تحریک کا زیادہ زور مردوں کی مخالفت پر دیا۔ ویسے تانیثیت کی خامی بھی یہی ہے جتنا زور مردوں کی مخالفت پر صرف کیا جاتا ہے کسی اور کام میں لگایا جائے تو یقیناً زیادہ مثبت نتائج سامنے آئیں گے۔

فرانس جہاں سے یہ تحریک شروع ہوئی تھی یہ ملک اس تحریک کے لئے بہت زرخیز ثابت ہوا اور یہاں پر تانیثیت خوب برگ و بار لائی۔ فرانس میں سیمون دی بوائر کی کتاب 'The Second Sex' اس حوالے سے خاص اہمیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۴۹ء میں منظر عام پر آئی۔ اس کتاب میں مصنفہ نے عورت کے ساتھ تاریخ میں روا رکھے جانے والے سلوک کی نشاندہی کی ہے۔ یہ کتاب بھی تانیثیت کی ذیل میں اہم اضافہ کہی جا سکتی ہے۔ جہاں مصنفہ نے عورت کے ساتھ روا رکھے جانے والے معاندانہ سلوک کی عکاسی کی ہے وہاں ہی یہ بھی بتایا گیا ہے کہ عورتوں کے ساتھ کیسا سلوک روا رکھا جانا چاہئے۔

اب تانیثیت نے امریکہ کا رخ بھی کیا۔ یہاں پر بھی بیٹی فرائیڈن کی کتاب 'The Feminine Mystique'۔ یہ کتاب امریکہ میں تانیثیت کی دوسری لہر کے اجراء میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ پہلی دفعہ ۱۹۶۳ء میں چھپی۔ مصنفہ نے اس کتاب کو بہت محنت کے ساتھ لکھا۔ عظمیٰ فرمان نے اس کے کتاب کے متعلق لکھا ہے:

"اپنے عہد کی یہ بے حد مقبول مگر متنازعہ کتاب رہی۔ بیٹی فرائیڈن نے صدیوں پرانے اس معاشرتی تصور پر ضرب لگائی کہ گھر اور بچوں کے ذریعے ہی عورت کی تکمیل ہوتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ایسے روایتی باطل تصورات کا شکار ہو کر عورت اپنی شناخت گم کر بیٹھتی ہے۔"(۱۱)

اس طرح یہ اپنے عہد کی ہنگامہ خیز کتاب تھی جس نے بہت سے روایتی تصورات پر کاری ضربیں لگائیں۔ عورت کو گھر کی چار دیواری سے نکل کر زندگی کی دوڑ میں بھرپور شرکت کی دعوت دی گئی۔ متذکرہ بالا تصانیف کے علاوہ بھی تانیثیت پر بہت کچھ لکھا گیا لیکن یہ مضمون طوالت کا متحمل نہیں ہو سکتا، اس لئے ان ہی کتب کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اب ذکر کہ مغرب میں اس تحریک کو نظریہ امواج کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے۔ اس کی تین اہم لہریں ہیں۔

"تانیثیت کی پہلی لہر انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے بعد دیکھی جا سکتی ہے۔ اس دوران عالمی منظر نامے پر عورتوں کے حوالے سے بڑی بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ مثلاً ۱۸۷۰ء میں آکسفورڈ اور کیمرج میں بھی عورتوں کے لئے درسگاہیں قائم کی گئیں۔"(۱۲)

دوسرا بڑا واقعہ اس سے قبل سامنے آیا۔

فیمنزم پر پہلی کانفرنس جولائی ۱۸۴۸ء کو امریکہ میں انعقاد پذیر ہوئی۔ اس لہر کے دوران عورتوں کے لئے ووٹ کے حقوق کا مطالبہ کیا گیا اور ساتھ ہی مساویانہ سیاسی حقوق دینے کی بات بھی کی گئی۔ آخر کار امریکہ میں عورتوں کو ووٹ کا حق ۱۹۱۹ء میں دیا گیا۔

تانیثیت کی دوسری لہر ۱۹۶۰ء کے بعد نمودار ہوئی۔ اس لہر میں عورتوں کے لئے معاشی لحاظ سے مساوی حقوق کا مطالبہ کیا گیا۔ اسی لہر کے دوران انگلستان میں ایک ایکٹ بھی سامنے آیا۔ جس کے متعلق عتیق اللہ نے لکھا ہے:

"آخر کار انگلستان میں ۱۹۷۵ء میں ایک ایکٹ کے تحت ان تمام امتیازات کو غیر قانونی

ٹھہرایا گیا جو صنف اور جنس کے لحاظ سے روز گار اور گھر دار میں بالخصوص اور ترقی کے مواقع میں بالعموم روا رکھے جاتے تھے۔"(۱۳)

اس طرح خواتین کی طویل جدوجہد ثمر آور ثابت ہوئی اور عورتوں کو قانونی طور پر مرد کے برابر شہری مان لیا گیا۔

تانیثیت کی تیسری لہر ۱۹۹۰ء تاحال جاری ہے۔ اس لہر کے دوران یورپ میں عورتیں زندگی کے تمام میدانوں میں مردوں کے برابر شریک ہوتے ہوئے نظر آئیں۔ اب صورتحال بدل چکی ہے۔ آزاد خیال خواتین ہر کام میں مردوں سے آگے نکلنے کی کوشش بھی کرتی ہیں اور اکثر اوقات کامیاب بھی ہوتی ہیں۔ یہ تو تھا مغرب میں تانیثیت کا تاریخی تناظر اور اس کو نظریاتی طور پر مشتہر کرنے کی کاوشوں کا جائزہ۔ اس لیے پیشگی کہا کہ تانیثی نظریہ مغرب کی دین ہے۔

اب اگر اردو ادب میں ہم تانیثی افکار کا جائزہ لیں تو نثری ادب میں ہمیں مایوسی نہیں ہوتی۔ ناول میں ڈپٹی نذیر احمد نے عورتوں کو تعلیم دینے کے لئے اپنے ناولوں میں کوشش کی ہے جبکہ اردو کے اولین افسانہ نگاروں میں سجاد حیدر یلدرم، پریم چند اور راشد الخیری کا نام لیا جاتا ہے۔ یلدرم کے ہاں عورت اور مرد برابری کی سطح پر نظر آتے ہیں۔ راشد الخیری نے بیوہ عورتوں کے دکھ کو بیان کیا ہے جبکہ پریم چند کے کفن پر ہی نظر ڈالیں تو عورت کے ساتھ روا رکھا جانے والا سلوک واضح ہوتا ہے۔

آگے چل کر خواتین افسانہ نگار بھی ہمارے سامنے آئی ہیں جن میں ڈاکٹر رشید جہاں کے ہاں تانیثی افکار واضح نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر رشید جہاں کے بارے میں ڈاکٹر سیما صغیر کی رائے مبنی بر حقیقت ہے:

"ہم عصر خواتین افسانہ نگاروں کے مقابل رشید جہاں انقلابی ذہن کی مالک تھیں۔ وہ معاشرے میں واضح تبدیلی لانا چاہتی تھیں۔ اس لئے انہوں نے آزادی نسواں کے دوسرے خواتین افسانہ نگاروں کی طرح مصالحانہ نہیں بلکہ جارحانہ رویہ اختیار کیا۔"(۱۴)

رشید جہاں نے عورتوں سے متعلقہ موضوعات کو کھل کر بیان کیا جس میں پسند کی شادی، جہیز، مہر، طلاق اور وراثت کے حقوق کو موضوع بنایا۔ ان کا افسانہ 'دلی کی سیر' تانیثیت کے حوالے سے بہت اہم چیز

ہے۔

اس کے بعد عصمت چغتائی کی صورت میں بھی نسائی آواز ہمارے سامنے آتی ہے اور ہمیں چونکا دیتی ہے۔ شادی کے موضوع پر عصمت چغتائی نے خوب بحث کی ہے۔ انہوں نے شادی کے بندھن پر تنقید کی ہے۔ دراصل صرف شادی کو مقصد بنا کر عورت کو رشتوں میں مقید کر دینا پدری سماج کی سازش ہے۔ انہوں نے اپنے افسانے ''چوتھی کا جوڑا'' میں اسی خیال کو پیش کیا ہے۔

ان افسانہ نگاروں کے بعد ایک طویل کہکشاں ہمیں اردو ادب کے آسمان پر نظر آتی ہے۔ جن میں اہم نام قرۃ العین حیدر، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، نثار عزیز بٹ، رضیہ فصیح احمد، جمیلہ ہاشمی، سائرہ ہاشمی، خالدہ حسین اور الطاف فاطمہ وغیرہ کے نام سامنے آتے ہیں۔

شاعری میں بھی شاعرات کی ایک طویل کہکشاں نظر آتی ہے۔ جنہوں نے عورت سے متعلقہ امور کو شاعری میں بیان کیا۔ ان میں نمایاں نام ادا جعفری، پروین شاکر، فہمیدہ ریاض کشور ناہید، ثمینہ راجہ اور زہرہ نگار وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

خواتین لکھاریوں نے خواتین کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہی صرف تانیثیت کے موضوعات کو اپنے اندر نہیں رکھتا بلکہ اس میں مردوں نے بھی عورتوں کے متعلق بہت اعلیٰ پارے کا ادب تخلیق کیا ہے۔ اسی بناء پر تانیثی ادب مرد اور عورت لکھاریوں کے حوالے سے الگ الگ نام دیا جاتا ہے:

> '' Feminist Critique کے تحت مرد تخلیق کاروں کے ہاں عورت کے کردار کا مطالعہ کیا جاتا ہے جبکہ Gynocritics کے تحت خواتین لکھاریوں کے ہاں عورت کی پیشکش کا جائزہ لیا جاتا ہے۔''(۱۵)

اس بحث سے ثابت ہوا کہ تانیثیت ایک ایسی تحریک کا نام ہے جو عورتوں کے لئے مردوں کے مساویانہ حقوق کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس کے تحت تخلیق کیا جانے والا ادب بھی الگ پہچان رکھتا ہے۔ اس تحریک نے سوچنے کی ایک اور جہت کو روشن کیا۔ اس کو ہم ایک تنقیدی پیمانے کے طور پر استعمال کر کے ادب کو نئے انداز سے سمجھنے کے لائق بھی ہو جائیں گے۔ مزید براں جامعاتی سطح پر موضوعات کی تلاش میں بھی آسانی رہے گی۔

ب۔ معاصر افسانے پر تانیثیت کے اثرات کا تجزیاتی مطالعہ:

افسانے میں تانیثی اثرات ہمیں بہت پہلے سے ہی نظر آتے ہیں۔ شروع میں مرد افسانہ نگار ہمارے سامنے ابھر کر آتے ہیں۔ اس حوالے سے سجاد حیدر یلدرم کا نام لیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے عورتوں کے ساتھ ہمارے معاشرے میں روا رکھے جانے والے سلوک کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ انسانی زندگی کے لئے جتنا مرد ضروری ہے اسی قدر عورت بھی ضروری ہے۔ عورت کے بغیر مرد اکیلا کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ اس فلسفے کو انہوں نے اپنے افسانے 'خارستان و گلستان و خار' میں پیش کیا ہے۔ پھر انہوں نے اپنے افسانے 'ازدواجِ محبت' میں بھی پڑھی لکھی عورت کو بطور کردار پیش کیا ہے جو ایک ریاست میں بڑی جاگیر کی مالک ہے۔ پریم چند نے بھی اپنے افسانوں میں عورت کے ساتھ روا رکھے جانے والے معاندانہ رویے کی بھرپور عکاسی اپنے افسانوں میں کی ہے۔ راشد الخیری نے بیوہ کے دکھ درد اور اس کی مشکلات کے بیان نے ان کے افسانوں کے خزینہ رنگ کو گہرا کر دیا ہے۔

پھر ترقی پسند تحریک کے دوران خواتین میں رشید جہاں کے افسانوں میں بھی تانیثی شعور بڑا گہرا ہے۔ وہ عورت کے استحصال کے بارے میں گہرا شعور رکھتی ہیں۔ آگے چل کر اردو افسانے میں حجاب امتیاز علی نے بھی عورت سے متعلقہ امور کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ بانو قدسیہ، جمیلہ ہاشمی، سائرہ ہاشمی، الطاف فاطمہ اور خالدہ حسین نے عورت کے بارے میں جو کچھ لکھا وہ الگ باب کا متقاضی ہے۔ اب ہم ذیل میں سہ ماہی 'ادبیات' میں شائع شدہ افسانوں کو تانیثیت کے تناظر میں احاطہ تحریر میں لاتے ہیں۔

i۔ صنفی امتیاز کی صورتوں کی عکاسی:

محمد الیاس کا شمار عصر حاضر کے اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ 'ادبیات' میں ان کے افسانوں کو سرفہرست رکھا جاتا ہے۔ ان کے افسانوں میں صنفی لحاظ سے مرد اور عورت کی تقسیم کے نتیجے میں روا رکھا جانے والا امتیازی سلوک واضح جھلکتا ہے۔ اس حوالے سے ان کا افسانہ 'تاریخ کے مسخرے' جو کہ ادبیات کے شمار ۹۶ میں شائع ہوا، ایک اہم افسانہ ہے۔ اس میں صنفی امتیاز کی عکاسی اس انداز سے کی گئی ہے:

"بہوؤں کو مخاطب کر کے کہتا" یہ کتی عورت جسے تم تینوں اماں بنائے پھرتی ہو، ہندونی

ہے، کھترانی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کا کلیجہ پھٹ گیا تھا اور عاشق ہو گئی۔ دن دہاڑے کتابیں پھینکیں اور اچھل کر میرے گھوڑ پر سوار ہوئی۔ کلمہ پڑھا نہ نکاح' مجھ سے چمٹ گئی۔ بڑی بدمعاش عورت ہے۔"(۱۶)

مرد کردار کے تلخ جملے متذکرہ بالا اقتباس میں درج ہیں۔ خاوند اپنی بیوی کے لئے اخلاقیات سے گرے ہوئے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ اگرچہ جب شادی ہو تو یہ خود بھی اس پر فریفتہ تھا لیکن اب وہ صرف اپنی بیوی کو مورد الزام ٹھہرا رہا ہے۔ یہی ہمارے معاشرے کا اجتماعی رجحان ہے۔ جب مرد اور عورت دونوں کوئی غلطی کے مرتکب ہوں تو اس کا سارا ملبہ عورت پر ڈال دیا جاتا ہے جبکہ مرد بھی اس کام میں برابر کا شریک ہے۔ متذکرہ بالا افسانے میں ہماری اسی روش کو بیان کیا گیا ہے۔ ویسے بھی تانیثیت کے حمایتی کہتے ہیں کہ صنفی امتیاز معاشرے کا پیدا کردہ ہے:

"اس تحریک سے وابستہ مصنفین sex (نر و مادہ) اور gender (تذکیر و تانیث) کے فرق کو واضح کرتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ سیکس قدرتی اور پہلے سے طے شدہ ہوتا ہے جبکہ جینڈر معاشرے کا تخلیق کردہ ہے۔"(۱۷)

دراصل صنفی لحاظ سے ہمارے معاشرے نے عورت کو مرد سے منفرد بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ عورت کو کمزور گردانا جاتا ہے۔ ساتھ ہی وہ متلون مزاج بھی واقعہ ہوتی ہے۔ اس طرح صنفی امتیازات ہمارے معاشروں ہی نے روا رکھے ہیں۔

محققین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جنسی لحاظ سے قدرت نے عورت کو مرد سے مختلف بنایا ہے جبکہ صنفی لحاظ سے فرق موجود نہیں ہے بلکہ ہمارے معاشرے کا تخلیق کردہ ہے۔ اس حوالے سے سیمون دی بوائر کا بیان کے عورت پیدا نہیں ہوتی بلکہ بنا دی جاتی ہے مبنی بر حقیقت ہے۔ عورت کو بعض اوقات جانور کے برابر بھی نہیں سمجھا جاتا۔ اس صورتحال کی نشاندہی انور سن رائے نے اپنے ایک افسانے 'سرکس کے ایک مسخرے کا اختتام' میں کی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو: "اس نے تاجر سے بات کی اور بیوی کے بدلے وہ گدھا لے لیا جو اسے سارے گدھوں میں معصوم، پرکشش اور بالکل گدھا دکھائی دیا۔"(۱۸)

اس طرح ایک مسخرے نے اپنی بیوی کو گدھے کے بدلے دوسرے آدمی کے حوالے کر دیا۔ دراصل مسخرے کی بیوی خوبصورت تھی لوگ اس کی جانب متوجہ ہوتے تھے۔ یہ بات مسخرے کو گوارانہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے گدھے کے بدلے بیوی کو فروخت کر دیا۔ ہمارے معاشروں میں ایسی قبیح روایات موجود ہیں جن میں عورت کو قربانی کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔ عورت کی غلطی نہ ہونے کے باوجود اس کو غلط سمجھنا اور بہتان تراشی ہماری رگ رگ میں سرایت کر چکی ہے۔ متذکرہ بالا افسانے میں ہماری اس روش کو بیان کیا گیا ہے۔

خالدہ حسین کے افسانوں میں بھی تانیثی شعور ملتا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں عورت سے منسوب معاملات اور ہمارے معاشرے میں اس کے متعلق پائے جانے والی روش کو بیان کیا ہے۔ ان کے افسانوں کے بارے میں ثمینہ اختر نے لکھا ہے:

> "خالدہ حسین کے افسانوں کے مطالعے سے معلوم پڑتا ہے وہ عورت کے سے منسوب یا اس پر لگے تمام الزامات دھو ڈالنا چاہتی ہے۔ وہ عورت کو لیبلز سے پاک دیکھنا چاہتی ہے۔ خالدہ حسین عورت کو از سر نو اور مکمل شناخت سے گزارنا چاہتی ہے۔ پہچان اور شناخت کی دولت سے مالا مال کرنا چاہتی ہے۔"(۱۹)

خالدہ حسین اعلیٰ پائے کی افسانہ نگار تھیں۔ ان کے افسانوں میں نسائی شعور واضح طور پر جھلکتا ہے۔ عورت ہونے کے ناطے انہوں نے عورت کو سمجھا اور عورت سے منسوب بہت سی اغلاط کا بطلان کیا۔ صنفی لحاظ سے عورت پر لگے ہوئے مختلف دھبوں کو دھونے کی بھرپور کاوش ان کے افسانوں میں نظر آتی ہے۔ معاصر افسانے میں تانیثیت کی ایک اور نمایاں آواز کرن شفقت کی نظر آتی ہے۔ ان کے ہاں بھی صنفی استحصال کی صورتوں کی عکاسی موجود ہے۔ ان کا افسانہ 'فیصلہ' ہمارے معاشرے میں عورت کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک کو طشت از بام کرتا ہے:

> "سوجھلا کے ماں باپ نے تو اسے ایسے گھر سے نکالا تھا جیسے وہ ان کے بیٹے کے لیے پیغام اجل ہے۔ وہ گھر سے نکلے گی تو بیٹا آئے گا۔ دوسری طرف تابش کے گھر والوں کے

لیے بھی سوجھلا کوئی تحفہ نہیں تھی۔ اپنے بیٹے کی جان کے عوض تھی، خون کا بدلہ تھی، قتل کا انتقام تھی۔"(۲۰)

کرن شفقت کے افسانے میں ہمارے معاشروں میں پائی جانے والی منفی روش کی عکاسی کی گئی ہے۔ سوجھلا متذکرہ بالا افسانے میں بنیادی کردار ہے۔ سوجھلا کا بھائی ایک قتل کر دیتا ہے۔ بدلے میں مقتول کے گھر والوں کو کچھ ہرجانہ اور سوجھلا کو بھی جرگے کے فیصلے کے بعد مقتول کے بھائی کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ اس کی مرضی نہیں پوچھی جاتی۔ کس انداز سے متذکرہ بالا افسانے میں صنفی امتیاز کو واضح انداز میں پیش کیا گیا۔ سوجھلا کے گھر والوں نے بیٹے کو بچانے کے لئے بیٹی کو بلا سوچے سمجھے مقتول کے بھائی تابش کے حوالے کر دیا۔ تابش کے گھر میں بھی اس کو مکمل طور پر نظر انداز رکھا گیا، اس پر طرح طرح کے ظلم روا رکھے گئے۔ اس طرح معاشرے میں ایک عورت کو قبیح رسومات کے بھینٹ چڑھتا ہوا دکھایا گیا ہے۔

جائیداد کے حوالے سے اسلام نے واضح تقسیم کی ہے۔ عورتوں کو جائیداد میں حصہ دیا گیا ہے۔ اس کے باوجود عورت کو جائیداد میں حصہ دینا معیوب سمجھا جاتا ہے بلکہ عورت اگر جائیداد کا مطالبہ کرے تو اس کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا ہے اس بارے میں طاہرہ اقبال کے افسانوں میں کیا رویہ رکھا جاتا ہے۔ اس بارے میں نورین روبی نے لکھا ہے: "طاہرہ اقبال کے افسانے 'شب خون' میں شہباز خان کی حویلی کا منظر دکھایا گیا ہے جس میں گھر کی عورتوں، حتیٰ کہ بیٹیوں کو بھی جائیداد کے حصول کیلئے قید کیا جاتا ہے۔"(۲۱)

ہمارے معاشرے میں عورت کو اس کا حق نہیں دیا جاتا۔ اگرچہ جائیداد میں اسلام نے اس کا حصہ مختص کر دیا ہے اس کے باوجود لوگ عورت کو جائیداد دینے میں کوتاہی کرتے ہیں۔ بھائی بہنوں سے اور والدین بیٹیوں سے معاندانہ سلوک روا رکھتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں مرد بہن کے حصے پر بھی اپنا ہاتھ صاف کرتا ہے اور خزانے کا سانپ بن کر بیٹھ جاتا ہے۔ اکثر اوقات دیکھا گیا ہے کہ عورت اگر جائیداد میں اپنا حصہ طلب کرے تو اس پر ظلم شروع کر دیا جاتا ہے اور اسے حق سے محروم کرنے کے لئے طرح طرح کے ہتھکنڈے دیکھنے کو ملتے ہیں۔

خالد فتح محمد معاصر افسانے کا ایک اہم نام ہے۔ معاشرہ جب عورت کے ساتھ معاندانہ سلوک روا رکھتا ہے تو عورت کے اندر بھی باغیانہ خیالات جنم لیتے ہیں اور صورتحال یہ بن جاتی ہے:

"تمہارا باپ وہاں بیٹھ کر۔۔۔ کتابوں اور علم کی باتیں کرتا تھا اور میں جاہلوں کی طرح منہ کھولے اس کی باتیں سنا کرتی تھیں۔ وہ باتیں میرے لئے اذیت تھیں اور مجھے شدید احساس کمتری میں مبتلا کرتی تھیں۔ وہاں میرے اندر ایک نئی عورت جنم لیتی تھی جو کسی کی بیوی تھی نہ کسی کی ماں، وہ بس ایک عورت تھی جس نے ٹکر لینے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔"(۲۲)

عورت کے ساتھ جب معاندانہ سلوک کی انتہاء ہو جائے تو اس کے اندر باغیانہ جذبات کا پیدا ہونا قدرتی عمل ہے۔ عورت شروع میں مقابلے پر آمادہ نہیں ہوتی اگر ہو جائے تو پھر اس کو ہرانا مشکل ہوتا ہے۔ متذکرہ بالا افسانے میں ایک ایسی ہی کم پڑھی لکھی عورت کا کردار ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس کا خاوند بہت پڑھا لکھا ہے۔ جب وہ کتابوں کی باتیں کرتا ہے تو اس کی بیوی احساس کمتری کا شکار ہو جاتی ہے۔ آخر کار اس کی بیوی اپنی جہالت ختم کرنے کا افیصلہ کرتی ہے اور وہ دن رات محنت کر کے علم حاصل کرتی ہے۔ اس کے بعد اس کے اندر باغیانہ تصورات جنم لیتے ہیں وہ اپنے آپ کو صرف عورت ہی تصور کرتی ہے۔ کمزور سمجھ کر عورتوں کے ساتھ ظلم روا رکھا جاتا ہے۔ ان پر ستم ڈھایا جاتا ہے۔ ایسا ہی موضوع اشفاق احمد کے افسانے میں بھی ہے: "اشفاق احمد نے افسانہ 'بابا' میں عورت کو کمتر اور کمزور سمجھ کر ظلم ڈھانے کے رجحان کی مذمت کی ہے۔"(۲۳)

مختلف افسانہ نگاروں نے عورت کے ساتھ روا رکھے جانے والے کسی بھی منفی سلوک کی مذمت کی ہے۔ امتیازی سلوک کیخلاف علم بغاوت مختلف افسانہ نگاروں کے ہاں نمایاں ہے۔

پاکستان میں مختلف رسم و رواج پائے جاتے ہیں۔ ایسے رسم و رواج کی کثرت ہے جس کی بھینٹ عورت چڑھتی ہے۔ اس بارے میں نورین روبی رقم کرتی ہیں:

"پاکستان کے مختلف علاقوں میں مختلف رسوم کی بھینٹ عورتوں ہی کو چڑھایا جاتا ہے۔ قتل کے بعد صلح جوئی کے لئے خاندان کی کنواری، خواہ وہ شیر خوار ہی کیوں نہ ہوں، دشمنوں کے حوالے کر دی جاتی ہیں۔"(۲۴)

متذکرہ بالا صورتحال ہمیں کرن شفقت کے افسانے 'فیصلہ' میں نظر آتی ہے۔ جس کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے۔ اس افسانے میں ایک عورت کو ایسے ہی قبائلی رسومات کی بھینٹ چڑھتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ افسانے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> "سوجھلا کے باپ نے اپنے بیٹے ساحر کو سزائے موت سے بچانے کے لیے اسے تابش کے بھائی سرمد کے قتل کے عوض بدلے میں دیا تھا۔ جرگے کے فیصلے کے مطابق طے ہوا تھا خمیسون خاندان اپنے بیٹے ساحر کو سزائے موت سے بچانا چاہتا ہے تو اسے مقتول کے خاندان کو بیس لاکھ نقد اور بیٹی کا رشتہ دینا ہو گا۔"(۲۵)

خمیسون خاندان نے اپنے بیٹے کو سزائے موت سے بچانے کے لئے بلا سوچے سمجھے بیس لاکھ اور بیٹی کو مقتول کے خاندان کے حوالے کر دیا۔ سرمد کا بھائی تابش تھا۔ سوجھلا اس کی زوجیت میں چلی گئی۔ وہاں پہنچ کر سوجھلا کے ساتھ جو رویہ رکھا گیا اس پر آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں۔ اس افسانے میں واضح طور پر صنفی امتیاز موجود ہے۔ بیٹے کے مقابلے میں بیٹی کو حقیر شے سمجھ کر فوراً گھر سے نکال دیا گیا۔ آگے مقتول کے گھر میں بھی اس کے ساتھ طرح طرح کے ظلم روا رکھے گئے۔ وہ اندر ہی اندر کڑھنا شروع ہو جاتی ہے۔ افسانے کے آخر میں وہ اپنے جذبات کی بھڑاس نکال کر کیتھارسس کرتی ہے۔

ایسے ہی صنفی امتیاز کی کئی صورتیں ہمیں افسانوں میں نظر آتی ہیں۔ پھر مرد کی بڑی سے بڑی غلطی کو معاف کر دیا جاتا ہے اس کے مقابلے میں عورت کی غلطی پر خوب لعن طعن کیا جاتا ہے۔ یہ بھی امتیازی سلوک کی واضح شکل ہمارے معاشرے میں نظر آتی ہے۔ "مرد کی بڑی سے بڑی خامیاں بھی نظر انداز کر دی جاتی ہیں جبکہ عورت کا چھوٹا سا عیب بھی قابل گرفت ہوتا ہے۔"(۲۶)

صنفی امتیاز کی یہی صورتحال ہمیں زاہدہ حنا کے ہاں بھی دکھائی دیتی ہے کہ عورت کے ساتھ صنفی امتیاز برتتے ہوئے اس پر طرح طرح کی پابندیاں لگائی جاتی ہیں۔ اس بارے میں فردوس انور قاضی کی رائے ملاحظہ ہو:

> "ان کے افسانوں میں ایک ایسی عورت نظر آتی ہے جس کے ذہن اور جسم پر سینکڑوں

زنجیروں کے نشان ہیں۔ یہ زنجیریں اسے تہذیب، مذہب اور معاشرتی رسم ورواج کے نام سے پہچانی جاتی ہیں۔"(۲۷)

معاشرتی رسم ورواج اور اقدار کے نام پر عورت کے جذبات پر طرح طرح کی زنجیریں لگائی جاتی ہیں جبکہ مرد ان زنجیروں سے مستثنیٰ ہوتا ہے۔ کبھی یہ زنجیر مذہب کے نام پر اور کبھی معاشرتی اقدار کے نام پر لگائی جاتی ہیں۔ مرد پر ایسی کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ اس طرح امتیازی سلوک ہمارے معاشروں میں پوری طرح سرایت کر چکا ہے۔ معاشرے کا فرد ہوتے ہوئے افسانہ نگار نے اس صنفی امتیازی سلوک کی عکاسی اپنے افسانوں میں بھرپور انداز میں کی ہے۔ محمد ظہیر بدر کا افسانہ 'اشتباہ نظر' ایسے ہی سلوک کی عکاسی کرتا ہے:

"میں ڈٹ گئی اور گھر والوں کو صاف کہہ دیا۔ اماں نے بہت منایا، ابا نے بہت پیٹا مگر میں نے نہ مانی، اماں نے سینے پر دو تھپڑ مار کر کہا، ہائے تم پیدا کیوں ہوئیں۔ ہائے تم پیدا ہوتے ہی کیوں مر نہ گئی۔"(۲۸)

متذکرہ بالا اقتباس افسانہ 'اشتباہ نظر' سے ماخوذ ہے۔ اس افسانے کا ایک نسوانی کردار انیلا ہے۔ شروع میں ہمارے سامنے ایک وفاشعار مشرقی بیوی کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ وہ اپنے خاوند عبدالباری سے مار کھاتی ہے۔ اس کے ساتھ دراصل دونوں طرف سے امتیازی سلوک کیا جاتا ہے۔ والدین اس پر دباؤ ڈالتے ہیں تو وہ عبدالباری سے شادی کرنے پر آمادہ ہوتی ہے۔ ویسے وہ اشرف نامی شخص سے محبت کرتی تھی۔ ہمارے معاشرے میں عورت اگر محبت کرے تو والدین یہی کہتے ہیں کہ وہ پیدا کیوں ہوئی تھی جبکہ اس کے مقابلے میں مرد اگر محبت کرے تو اس کے لئے تحسینی کلمات کہے جاتے ہیں۔ یہی ہمارے معاشرے کی دوغلی روایات بن چکی ہیں۔ بحیثیت انسان عورت اور مرد برابر ہیں لیکن ہم نے دونوں کے لیے الگ الگ معیارات اپنا لیے ہیں۔ جب کبھی عورت اپنے حق کے حصول کے لئے ڈٹ جاتی ہے تو اس کو غلط سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح ہم صنفی امتیاز کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔

بہت کم ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ عورت اپنی مرضی سے شادی کر سکے جبکہ مرد اکثر اوقات اپنی مرضی سے شادی کرتا ہے۔ اس طرح ہمارے معاشروں میں موجود صنفی امتیاز کی عکاسی ہمیں معاصر افسانے

میں نظر آتی ہے۔

ادبیات کے شمارہ ۱۰۹ میں چھپنے والا افسانہ 'قصہ اس بہری یخ بستہ رات کا' جو حنیف باوا نے لکھا ہے تاینیثیت کے حوالے سے ایک اہم افسانہ ہے۔ اس میں بھی عورت اور مرد کے لئے الگ الگ معیارات کی طرف توجہ مبذول کروانے کی کوشش کی گئی ہے:

> "جس گھر کی عزت کو تو نے مٹی میں ملایا۔ پھر اس گھر کے دروازے کھٹکا رہی ہو۔ جا میں تجھے۔۔۔' اتنا کہہ کر نوجوان نے دروازہ بند کر دیا۔ ایسا کرنے سے وہ سمجھنے لگا تھا کہ شاید اس کے سر سے تمام بوجھ اتر گیا تھا اور بہن کی طرف سے کوئی بھی قرض باقی نہیں رہا تھا۔"(۲۹)

متذکرہ بالا اقتباس جس افسانے سے ماخوذ ہے اس میں قانون قدرت کی عکاسی کی گئی ہے۔ جیسا بوگے ویسا کاٹو گے۔ ایک مرد کردار کسی دوسری لڑکی کے قریب جاتا ہے۔ لڑکا اور لڑکی گھر کے اندر ہوتے ہیں۔ رات ڈھل چکی ہوتی ہے تو اتنے میں دروازے پر دستک ہوتی ہے لڑکا دروازہ کھولتا ہے تو سامنے اس کی بہن کھڑی ہوتی ہے۔ اس کی حالت ناگفتہ بہ ہوتی ہے۔ وہ بھی بھائی کی طرح کوئی مہم سر کر کے آچکی ہے۔ بھائی فوراً سمجھ جاتا ہے۔ اب اگر بھائی خود غیر اخلاقی فعل کر رہا ہے تو وہ بہن کو بولنے کا حق دار نہیں۔ ہاں اگر انسان خود پاک ہو تو وہ دوسروں کو روکنے کا مجاز ہے ورنہ بات وہی ہے دوسروں کو نصیحت خود میاں فضیحت۔ پھر لڑکا جب بہن کو دیکھتا ہے تو وہ بہت ترش الفاظ کا استعمال کرتا ہے۔ اسے گھر کے اندر آنے کی اجازت بھی نہیں دیتا اور فوراً دروازہ بند کر دیتا ہے جب وہ یہ کرتا ہے تو سمجھتا ہے کہ وہ اس کی بہن نہیں ہے جبکہ اندر بھی ایک لڑکی اس کے بستر پر موجود ہے وہ بھی کسی کی بہن ہے۔

ہمارے معاشرے میں عورت اور مرد کے لئے ایسے ہی دوہرے معیار ہیں۔ عورت سے اگر گناہ سرزد ہو جائے تو اسے بہت کوسا جاتا ہے جبکہ مرد کو اکثر مزید کرنے پر اکسایا جاتا ہے۔ دراصل یہ معیارات ہم نے خود تراشے ہیں یہی صنفی امتیازات کی صورتوں کو ہم نے معاشرے میں رواج دیا ہے اور اب اس کا عکاس ہمارا ادب بھی ہے۔

ہمارے ہاں اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ مرد عورت کے ساتھ جذباتی وابستگی کی بجائے جسمانی وابستگی

رکھتا ہے وہ اس کے جذبات کی پرواہ نہیں کرتا ہے مثلاً "جب کہ میرے رویے کی وجہ یہ تھی کہ مرد کا ہمیشہ سے یہی سبھاوار ہا ہے کہ وہ عورت کی من کا منا جانے بنا ہی اپنی مرضی اس پر مسلط کرنا چاہتا ہے۔"(۳۰)

آئے روز مشاہدے میں آیا ہے کہ مرد عورت کو اپنی مرضی کے تابع کرنا چاہتا ہے یہ الگ بات ہے کہ آج کے دور کی عورت اپنی ہی من مانی کرتی ہے۔ ہر جگہ یہ صورتحال نہیں ہے البتہ دور دراز قبائل میں اب بھی صورتحال تسلی بخش نہیں ہے۔

عصر حاضر کے اہم افسانہ نگاروں میں ایک نام محمد الیاس کا بھی ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں عصر حاضر کے مسائل اور رجحانات کو بڑی خوبی و خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کا افسانہ 'قضائے معلق' جو کہ شمارہ ۱۱۳ میں شامل ہے۔ ان کے متذکرہ بالا افسانے میں جدید خیالات کی حامل عورت دکھائی گئی ہے۔:

> "لیکن اتنا بھی بے رحم نہ ہو کہ عورت کو صرف استعمال کی چیز ہی سمجھے۔ زمانہ بدل گیا ہے دادی اماں! آپ نے مجھے یونیورسٹی تک تعلیم دلوائی ہے۔۔۔ یہ دور خود آگاہی کا ہے، جس کے مطابق عورت اور مرد دونوں برابر کے انسان ہیں۔"(۳۱)

مذکورہ بالا اقتباس میں ہمیں جدید خیالات کی حامل عورت دکھائی دیتی ہے جو معاشرے کی فرسودہ روایات پر کڑی تنقید کرتی ہے۔ معاشرے میں عورتوں پر روا رکھے جانے والے مظالم پر بھی تنقید کرتی ہے۔ یہ ایک یونیورسٹی کی سطح تک پڑھی ہوئی ہے۔ دراصل اس کا خاوند بہت ظالم ہے۔ وہ اس کے ساتھ ناروا سلوک رکھے ہوئے ہے۔ جب اس کا دل کرتا ہے تو وہ اپنا نشہ اتار لیتا ہے۔ پھر جب جھگڑا ہوتا ہے تو اس کو مارا پیٹا جاتا ہے تو یہ گھر سے بھاگ کر میکے واپس آ جاتی ہے جہاں پر دادی سے مکالمہ کرتی ہے کہ اب دور بدل چکا ہے۔ معاشرے میں خود آگاہی پیدا ہو چکی ہے۔ عورت نے اپنے حقوق حاصل کر لئے ہیں۔ لہٰذا اب مارنے پیٹنے والا دور ختم ہو چکا ہے۔ اب رشتے برابری کی سطح پر چلتے ہیں اس افسانے میں صنفی سطح پر روا رکھے جانے والے سلوک کی بھرپور انداز میں نفی کی گئی ہے۔

اس ساری بحث سے ظاہر ہوتا ہے کہ آج چاہے مرد ادیب ہو یا عورت دونوں کے ہاں تانیثیت کے اثرات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ آج کا لکھاری مختلف معاشروں میں عورت کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک کی عکاسی کرتا ہے۔ دوسرے معیارات پر تنقید کرتے ہوئے ہمیں اپنا قبلہ درست کرنے کی تلقین

فرماتا ہے۔ وہاں ہی نئے اور جدید زمانے کی عورتوں کو بطور کردار پیش کر کے حالات کو بدلنے کے لئے قلمی جدوجہد کرتا ہے۔ اس طرح مندرجہ بالا بحث سے ظاہر ہوا کہ معاصر افسانے میں صنفی امتیاز کی کئی جہات پہلو بہ پہلو نظر آتی ہیں۔

ii۔ صنفی استحصال کی عکاسی:

معاصر افسانے میں جب ہم تانیثی اثرات کا جائزہ لیں تو ایک واضح عنصر ہمیں صنفی استحصال کا نظر آتا ہے۔ صنفی استحصال سے مراد ہے کہ خواتین کے جائز حقوق ان کو نہ دینا۔ ان کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنا اور ان کے ساتھ ظلم کرنا وغیرہ صنفی استحصال کی شکلیں ہیں۔ ساتھ معاصر افسانے میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح مرد عورتوں کا استعمال کر کے اپنے مقاصد حاصل کرتے ہیں اور پھر ان سے آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔ پہلے ان کو اس طریقے سے استعمال کرتے ہیں اور ان کی کمائی ہوئی دولت کو دونوں ہاتھوں سے لوٹتے ہیں اور بعد میں جب عورتیں مزید کام کرنے کے قابل نہ ہیں رہتیں تو ان کے ساتھ غیر اخلاقی رویہ روا رکھا جاتا ہے۔ پھر بیوی پر معاش کی تمام ذمہ داریاں ڈالنا، بیٹیوں کو مزدوری کرنے کے لئے بھیج دینا اور ہم عصر معاشرے میں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ خواتین کو جنسی طور پر ہراساں کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور ان کی عصمت دری کی جاتی ہے۔ چھوٹی بچیوں کی عصمت دری کے واقعات ہمیں مسلسل سننے کو ملتے رہتے ہیں۔ پھر مدد کے نام پر عورتوں کا جنسی استحصال بھی کیا جاتا ہے۔ خواتین کو مارنے پیٹنے اور ان پر تیزاب پھینکنے کے واقعات ہم روز خبروں میں سنتے ہیں۔ یہ صنفی استحصال کی صورتیں ہیں۔ ان کا ذکر ہمارے عہد کے افسانہ نگار نے کیا ہے۔ اس نے صنفی استحصال کی متذکرہ بالا صورتوں کو اپنے افسانوں میں موضوع بنایا ہے۔ ہمارے معاشرے میں بہتان تراشی کا رواج بھی موجود ہے۔ یہ بھی اس عورت کی عزت کا استحصال کیا جاتا ہے جس پر کوئی بہتان لگایا جاتا ہے۔ انور سن رائے نے اپنے افسانے 'سرکس کے ایک مسخرے کا اختتام' میں اس موضوع کو لیا ہے، انداز ملاحظہ ہو:

> "وہ پانچ سال کا تھا جب اس کا باپ قتل ہوا، اس کی ماں اپنے میاں کے قاتل کے ساتھ بھاگ گئی۔ یہ سارا قصہ انہی لفظوں میں گاؤں والوں نے کئی سال کے دوران طعنوں اور ہنسی میں سنایا اور جب اس نے دادی سے پوچھا تو اس نے کہا 'خدا ان کا پانی تنگ کرے۔ یہ جھوٹے اور حرامی ہیں۔ غریب عورت پر زبان چلاتے ہیں۔ تیری ماں تو بکری کے

دودھ جیسی پاک تھی، تیرے باپ نے اسے پتوں میں ہار دیا۔"(۳۲)

متذکرہ بالا افسانے میں ہمارے معاشرے میں پائے جانے والی فرسودہ روایات کی عکاسی کی گئی ہے۔ ہم لوگ بہتان تراشی میں بہت ذوق محسوس کرتے ہیں۔ اس طرح عورت کی عزت کا استحصال کیا جاتا ہے۔ اس افسانے میں ایک کردار اپنی دادی سے محوِ گفتگو ہے۔ دادی اس کو اس کی ماں کے بارے میں بتاتی ہے۔ جس پر گاؤں والوں نے طرح طرح کے الزامات عائد کئے، یہ بھی کہا گیا کہ وہ مجرم اور قاتل کے ساتھ بھاگ گئی حالانکہ وہ بہت پاکباز عورت تھی۔ دوسری جانب گاؤں والوں کے تخریبی ذہن اور جہالت کی انتہاء تھی جنہوں نے اس کی ماں کے متعلق چگہ مگوئیوں کو جنم دیا۔ گاؤں والوں کا رویہ ہماری مجموعی فطرت کی نشاندہی کرتا ہے کہ ہم دوسرے کے عیب مزے لے کر بیان کرتے ہیں۔ ایسے ہی گاؤں والوں نے اس کی ماں کے متعلق جو بہتان لگائے تھے، گاؤں والے ان کا ذکر تفریح طبع کے طور پر کرتے تھے جبکہ حقیقت میں ایسا کچھ موجود نہ تھا بلکہ اس لڑکے کے باپ نے اپنی بیوی کو جوئے میں ہار دیا تھا۔ اس انداز سے ایک عورت کا اخلاقی، جنسی اور جسمانی استحصال کیا جارہا تھا۔ ایسے ہی انور سن رائے نے ہمارے معاشرے کے اس رخ کی تصویر کو ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔

نچلے طبقے میں ایک اور رجحان یہ سامنے آتا ہے کہ عورت پر معاشی بوجھ ڈالا جاتا ہے۔ اس پر بعض اوقات اس قدر ظلم کیا جاتا ہے کہ وہ جسم فروشی کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ افسانہ نگاروں نے اس حقیقت کو بھی آئینہ دکھایا ہے۔ سلیم آغا قزلباش رقم کرتے ہیں:

> "جبکہ نچلے طبقے کی عورت کو خاوند کے نشے کی لت اور بیروزگاری کی وجہ سے بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے جسم فروشی پر بھی مجبور ہونا پڑتا ہے۔ اس صورتحال نے مرد اور عورت کے درمیان کشمکش پیدا کی ہے۔"(۳۳)

بعض جگہوں پر المناک صورتحال بھی دکھائی دیتی ہے۔ جہاں پر خاوند کو نشے کی لت لگ جائے، اس گھر کی عورت استحصال کا شکار ہو جاتی ہے۔ خاوند نشے کو پورا کرنے کے لئے طرح طرح کے حربے استعمال کرتا ہے، دنیا و مافیا کا ہوش نہیں ہوتا، تمام گھریلو ذمہ داریوں سے لاتعلق ہوتا ہے۔ ایسے میں نچلے طبقے کی عورت

جسم فروشی پر بھی مجبور ہوتی ہے۔

کچھ عورتیں معمولی ملازمتیں کرتی ہیں وہاں پر بھی ان کے ساتھ منفی رویہ روا رکھا جاتا ہے۔ جب ایسی صورتحال جنم لے تو معاشرے کی پہلی اکائی خاندان ہی کمزور ہو گا۔ میاں بیوی کے درمیان رشتہ کمزور ہو گا۔ ان کے مابیں آئے روز کے جھگڑے ہوں گے۔ صنفی استحصال کی متذکرہ بالا صورتحال کی عکاسی خالد فتح محمد کے افسانوں میں موجود ہے۔ ان کا افسانہ 'دیواروں کے راز' جو کہ ادبیات کے شمارہ ایک سو تین میں شائع ہوا ہے۔ ایسی صورتحال کے مطالعے کے بعد آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں۔ صورتحال ملاحظہ ہو:

> "مجھے پتا ہے کہ بچے کا باپ کون ہے۔ بچے کا باپ تمہارا آشنا صاحب ہے اور میں ناجائز بچے کو اپنا نام نہیں دے سکتا۔ محمد دین نے دہرایا اور نہ ہی ایسی ماں کو اپنے گھر میں رکھ سکتا ہوں۔ وہ رکا اور آگ بھری آنکھوں کے ساتھ اس نے مغلاں کو دیکھا۔ 'بہتر ہے تم چلی جاؤ۔"(۳۴)

اس افسانے میں ایک نسوانی کردار مغلاں ہے۔ محمد دین اس کا خاوند ہے۔ محمد دین بیوی کے ہمراہ گاؤں چھوڑ کر شہر کا رخ کرتا ہے۔ شہر میں آکر وہ طرح طرح کے سپنے دیکھتا ہے اور ان سپنوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اپنی بیوی کا استعمال کرتا ہے۔ وہ خود اس کو کاروبار کے لئے بھیجتا ہے۔ جب وہ سب کچھ حاصل کر لیتا ہے۔ کچھ عرصے بعد اسے معلوم پڑتا ہے کہ اس کی بیوی امید سے ہے۔ بیوی کے پیسوں سے گھر تعمیر ہوا ہوتا ہے۔ وہ بیوی کو گھر سے نکال دیتا ہے۔ یہ کس قدر عورت کا استحصال ہے۔ پہلے اس کی عزت اور جسم کا استحصال کیا جاتا ہے اور آخر میں جذباتی طور پر استحصال کیا جاتا ہے۔ ایسے واقعات ہمارے معاشرے میں آئے روز رونما ہوتے ہیں۔ ادیب جو کہ گہرے مشاہدے کا مالک ہوتا ہے ان مشاہدات کو اپنے ادب پاروں میں دوام بخشتا ہے۔ ایسے ہی نازک موضوع پر شمع خالد کا افسانہ 'پچھتاوے' بھی ہے۔ شمع خالد نے اپنے افسانے 'پچھتاوے' مشمولہ 'پتھریلے جسم' میں 'بیوی کو جنسی استحصال کے ذریعے ایک نفع بخش شے بنا دینے کی تلخ حقیقت کو بیان کیا ہے۔'(۳۵)

اس طرح بیوی کو مادی ضرورتوں کو پورا کرنے کا ذکر متذکرہ بالا افسانوں میں موجود ہے۔ یہی ہمارے معاشرے کی بھیانک صورتحال ہے جس میں عورت کا استحصال عام سی بات ہے۔ استحصال کی ایک صورت یہ

بھی ہے کہ کسی عورت کی مدد کرنے کے نام پر اس کی عزت پر ہاتھ ڈالنا بھی اب روایت بنتا جارہا ہے۔ ایسا ہی ایک افسانہ نیلم احمد بشیر نے 'اکیلی' کے نام سے لکھا ہے۔ جس میں ایک عورت کا خاوند دنیا سے پردہ فرما چکا ہے، وہ اکیلی زندگی بسر کر رہی ہے پھر اس کا ایک جاننے والا شخص جس کا نام مائیکل ہے بازار سے سودا سلف لا کر دیتا ہے۔ شروع میں عورت اس سے بہت متاثر ہوئی لیکن بعد میں مائیکل کی مہربانیوں کا رخ بدلنے لگا۔ ایک دن تو مائیکل نے سوال کر ڈالا: "اس نے مجھے صاف لفظوں میں پوچھا کہ کیا وہ میری کوئی اور نیڈ بھی پوری کر سکتا ہے۔"(۳۶)

اس طرح ہمارے معاشرے میں عورت کی مدد کے نام پر اپنے جنسی جذبوں کی پیاس بجھانے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ معاصر افسانے میں نیلم احمد بشیر کا نام بھی اہم ہے۔ نیلم احمد بشیر کا ایک اور افسانہ بھی اس طرح عورت کے استحصال پر بحث کرتا ہے۔ جس کا حوالہ ڈاکٹر انوار احمد نے دیا ہے:

> ""نئی دستک' اپنے موضوع اور اظہار کے اعتبار سے کافی بلند آہنگ اور تانیثی ادب کی ایک اہم مثال ہے۔ میاں بیوی کے تعلق میں عورت کو صرف منفعل وصول کنندہ کے طور پر قبول کیا جاتا ہے جبکہ وہ مرد کے مقابلے میں اپنے جنسی تجربے کی حسیت کو نبھانے اور اسے خوبصورت بنانے کی زیادہ صلاحیت رکھتی ہے۔"(۳۷)

عورت کے جنسی جذبات کی نفی کا ذکر متذکرہ بالا افسانے میں کیا گیا جبکہ نیلم احمد بشیر کا دعویٰ ہے کہ یہ صلاحیت عورت میں زیادہ ہے۔

ہمارے عہد میں عورت پر ہاتھ اٹھانا اور اس کو مارنا بھی عام ہو چکا ہے۔ معاصر افسانے میں اس کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ محمد ظہیر بدر کا افسانہ 'اشتباہ نظر' جس کا تذکرہ باب کے پہلے حصے میں بھی ہوا ہے، اس افسانے میں عورت کے ساتھ روا رکھے جانے والے ظلم کی عکاسی بھی موجود ہے۔ عورتوں پر تیزاب پھینکنے اور مارنے پیٹنے کے واقعات بھی منظر عام پر آتے رہتے ہیں، افسانہ نگاروں نے ان کو موضوع بنایا ہے۔ محمد ظہیر بدر نے اس انداز سے اس جہت پر نظر ڈالی ہے:

> "اس کے ماتھے پر ضرب کا نشان تھا۔ اس کے پھٹے ہوئے ہونٹ پر خون جما ہوا تھا۔ اس

کے شوہر نے آج پھر اسے پیٹا تھا مگر اب وہ خود کہہ رہی تھی کہ اب سمجھنے سمجھانے کا وقت گیا۔"(۳۸)

انیلا اس افسانے کا کردار ہے جس پر اس کا شوہر عبد الباری ظلم کرتا ہے، بات بات پر وہ اس کو پیٹتا ہے۔ یہ صورتحال ہمارے معاشرے کی تصویر کو بھرپور انداز میں ہمارے سامنے لاتی ہے۔ ہمارے ہاں ایسی فرسودہ روایات موجود ہیں جن کی رو سے عورت پر جسمانی تشدد کیا جاتا ہے۔ یہ ہماری گھٹی میں بھی موجود ہیں۔ ہم قدامت پسندی کو بھی اس معاملے میں نہیں چھوڑتے۔ بعض دفعہ عورتوں پر جسمانی تشدد کی انتہاء کی جاتی ہے۔ "صرف ۲۰۱۱ء میں اور ۲۰۱۲ء میں رپورٹ کے مطابق ۳۲ خواتین نے گھریلو رنجشوں کی وجہ سے خودسوزی کی یا ان کو جلایا گیا۔"(۳۹)

اس طرح جسمانی تشدد کی خبریں آئے روز ٹی وی پر دیکھنے اور اخبارات پر پڑھنے کو ملتی ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اب اس استحصال کا کوئی سدباب بھی نظر نہیں آتا ہے۔ دوسری طرف ہم عورت کا جذباتی اور اخلاقی طور پر استحصال کرتے ہیں۔ ایک مرد اگر خود جتنا بھی غلط ہو تو اس کو اپنی خطا نظر نہیں آتی، یہ بھی احساس نہیں ہوتا کہ اس کے ایسے رویے سے اس کی بیوی پر کیا اثر مرتب ہو گا۔ اگر بیوی سے ذرا سی لغزش ہو جائے تو نوبت طلاق تک پہنچ جاتی ہے۔ اگرچہ فوزیہ رانی کی ذیل میں مذکور کچھ باتوں سے انکار کیا جا سکتا ہے:

> "اردو افسانے میں بیوی کے کردار میں عورت ہمیں شوہر کی دست نگر نظر آتی ہے، بیوی کی حیثیت سے وہ شوہر کی محبت کی طلب گار، اس سے وفا نبھاتی، سمجھوتے کرتی اور قربانیاں دیتی نظر آتی ہے۔ بعض صورتوں میں سخت ناانصافی اور استحصال پر مبنی رویوں کی زد میں بھی ہے۔"(۴۰)

یہ صورتحال کچھ دیر پہلے کی تھی جب عورت روایتی ڈگر پر تھی۔ اب صورتحال بدل چکی ہے۔ اب عورت ایک دم بغاوت پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ اب شعور بڑھ چکا ہے، اس لئے صرف یہ کہنا کہ عورت شوہر کی دست نگر ہے، قطعی درست معلوم نہیں ہوتا۔ بہت سی جگہوں پر یہ قانون معیار پر پورا اترتا ہوا نظر نہیں آئے

گا۔ یہ الگ بات ہے بعض صورتوں میں نچلے طبقے میں عورت کا استحصال کیا جاتا ہے۔ جس کا اظہار خالد فتح محمد کے افسانے 'دیواروں کے راز' میں موجود ہے۔

بعض افسانوں میں ہمیں روایتی عورت کا کردار بھی نظر آتا ہے۔ محمد الیاس کے افسانے 'خاندانی لوگ' میں مشرق کی وفاشعار بیوی کا کردار ملاحظہ ہو:

> "چونکہ میرے شوہر کے نزدیک میری افادیت لونڈی سے زیادہ نہیں، گھر سے باہر جو انتظامات کر رکھے ہیں۔ میرے خیال میں ان لونڈیوں کی ناز برداریاں کرتا ہو گا، بلکہ عین ممکن ہے کہ مجھ سے زیادہ اہم جانتا ہو گا۔"(۴۱)

اس افسانے میں واحد متکلم نسوانی کردار اپنے والد کو خط لکھتا ہے۔ اس خط میں ہمیں روایتی سوچوں کی حامل لڑکی نظر آتی ہے جو اپنے خاوند کو بڑے رتبے پر فائز کیے ہوئے ہے۔ خود کو شوہر کی لونڈی سمجھتی ہے لیکن خاوند کا رویہ مثبت نہیں ہے۔ وہ باہر بھی اپنی ہوس مٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ گھر میں بیوی رکھ کر ادھر ادھر منہ مارنا دراصل بیوی کے حقوق کی تلفی ہے۔ اس کے حقوق کا استحصال ہے۔ ہمارے معاشروں میں ایسے اقدام روا رکھے جاتے ہیں۔ معاصر افسانہ نگار کی نگاہِ تیز نے اس بات کو محسوس کیا ہے اور پھر اس کا تذکرہ اپنے افسانوں میں بھی کیا ہے۔

نازیہ خلیل عباسی کے افسانے 'کسک' میں دو نسوانی کردار ہیں ان کرداروں کے ذریعے ہمارے معاشرے کی ایک اور ناگوار تصویر پیش کی گئی ہے۔ گھر میں باپ ہونے کے باوجود جوان بیٹی کو معاشی اخراجات پورے کرنے پر لگا دیا جاتا ہے۔ اس افسانے میں ایسے ہی کردار ہمارے سامنے آتے ہیں جنھوں نے گھر کی معاشی ذمہ داریوں کا بوجھ ناتواں کندھوں پر اٹھایا ہوا ہے:

> "کچھ کھانے کو نہیں ہے ماں؟ نجو نے قدرے چیختے ہوئے پوچھا۔ 'کیا ہو گیا ہے تجھے! کہاں سے لاؤں۔ میں تیرے کھانے کے لئے؟ کل بھی تو کام پہ نہیں گئی اور اس سے پہلے بھی کام سے چھٹی کی۔ گھر دو روپے آئیں گے تو کچھ بنے گا اور تیرے تو آج بھی تیور کام پر جانے کے نہیں ہیں۔"(۴۲)

نجو اس افسانے کا مرکزی نسوانی کردار ہے وہ پھیری کا کام کرتی ہے۔ وہ روزانہ گلیوں میں سامنے بیچنے جاتی ہے۔ ایک دن اس کی طبیعت خراب ہوتی ہے تو وہ کام پر نہیں جاسکتی، اس پر اس کو ماں کن تلخ جملے سننے کو ملتے ہیں۔ پھر ناسازی صحت کے باوجود اس پر کوئی رحم نہیں کر رہا بلکہ اُلٹا اس کو کہا جاتا ہے کہ تمہارے تیور کام پر جانے کے نہیں ہیں۔ ایسے حالات میں کوئی بھی ہو اس کی دلجوئی کرنی چاہئے لیکن ہم مادیت پرستی میں آکر استحصال کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اسی استحصالی رویے کو متذکرہ بالا افسانے میں مصنفہ نے عیاں کیا ہے۔ اسی افسانے میں آگے چل کر نجو کو ایک لڑکا شادی کا پیغام بھیجتا ہے لیکن نجو کا والد اس کو محلے کے ہی گنوار لڑکے سے شادی کروا دیتا ہے۔ نجو ایک لمحے اول الذکر لڑکے کے ساتھ بھاگنا چاہتی ہے لیکن جب اس کے ذہن میں یہ بات آتی ہے تو وہ اپنے فعل سے باز رہتی ہے: "اگر میں چلی گئی تو اباماں کو قتل کر دے گا۔"(۴۳)

اب اگر بیٹی کی غلطی ہو تو مار اس کی ماں کو پڑتی ہے جبکہ باپ بھی ماں کے برابر سزا کا مستحق ہے۔ استحصال کی یہ صورت آج بھی ہمارے ہاں موجود ہے۔

ہمارے معاشرے میں دراصل طوائف پیدا نہیں ہوتی بلکہ بنادی جاتی ہے۔ پیسے دے کر جنسی تسکین کا سامان کیا جاتا ہے لیکن کوئی بھی اس طبقے کو اپنانے کو تیار نہیں ہے۔ اس بارے میں نورین روبی کی رائے سے اتفاق کئے بغیر نہیں رہا جاسکتا ہے۔

> "ناجائز تعلقات اور جسم فروشی کی مختلف صورتیں وہ ناسور ہے، جو معاشرے کے رگ و ریشے میں سرایت کر جاتے ہیں تو سماجی روح کو کھوکھلا کر دیتا ہے تو کبھی غربت و افلاس کے ہاتھوں جسموں کے سودے ہوتے ہیں۔"(۴۴)

غربت، افلاس اور معاشی بدحالی وہ اسباب ہیں جو عورت کو طوائف کی صف میں پہنچا دیتے ہیں۔ پھر استحصال کی ایک لمبی داستان چلتی ہے۔ پیٹ کی آگ بجھانے اور دوسری ضروریات زندگی پوری کرنے کے لیے جسم فروشی جیسی لعنت معاشروں میں جڑ پکڑ لیتی ہے۔

پھر عورت کو ہمارے ہاں ذریعہ معاش بھی بنایا جاتا ہے۔ یہ صورتحال بھی منفی ہے۔ معاش کے حوالے سے عورت آزاد ضرور ہے لیکن مجبور نہیں کرنا چاہئے۔ عامر رضا کا افسانہ 'زحل، مشتری کے اثر میں' اس افسانے میں ہمارے معاشرے کی اس متذکرہ بالا جہت کی عکاسی کرتا ہے۔

"شیخ صاحب کے بڑھتے ہوئے قرض کے بدلے میں اس نے بیوی کو ان کے گھر پر جھاڑو پونچھے پر لگا دیا۔ غریب عورت کو خاندان کی طرف سے آسرا ہوتا تو شاید کبھی یہ کام نہ کرتی لیکن حالات اس قدر خراب ہو گئے تھے کہ اس کے علاوہ کوئی حل نہ تھا۔"(۴۵)

قرض خاوند نے لیا، کوئی اور محنت کر کے قرض اتارنے کی بجائے بیوی کو دوسرے شخص کے گھر کام پر لگا دینا بھی استحصالی رویہ ہے۔ کام کی نوعیت بھی ایسی ہے جس کو دوسرے کے گھر کرنا اکثر حقیر سمجھا جاتا ہے۔ ایسے ہی استحصالی رویوں کی عکاسی معاصر افسانے میں کی گئی ہے۔

مندرجہ بالا بحث سے ظاہر ہوا کہ ہم عصر افسانے میں تانیثی افکار پوری طرح موجود ہیں۔ بہت سے افسانوں میں صنفی امتیاز کی عکاسی کی گئی۔ معاشرے میں عورت اور مرد کے لئے دوہرے معیارات کی موجودگی۔ بیٹے کو بیٹی کے مقابلے میں ترجیح دینا، بیٹی کو غلطی پر کڑی سزا دینا جب کے مرد کی غلطی پر خاموش ہو جانا یہ تمام صنفی امتیازات ہیں جبکہ صنفی استحصال یہ ہے کہ بیوی کو مارنا، پیٹنا۔ بیوی کی صورت میں عورت کے گھر پر موجود ہونے کے باوجود باہر جا کر اپنی جنسی پیاس بجھانا۔ جنسی معاملات میں عورت کو صرف وصول کنندہ سمجھ کر اس کے جذبات کا ادراک نہ کرنا صنفی استحصال کی صورتوں کی بھرپور عکاسی آج کے افسانے میں موجود ہے۔ خواتین لکھاریوں کے ساتھ ساتھ مرد لکھاریوں کے ہاں بھی تانیثی افکار بڑے گہرے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ عتیق اللہ، تانیثیت ایک مطالعہ (مضمون) مشمولہ: تانیثیت اور اردو ادب، ڈاکٹر، پورب اکادمی، مرتبہ: قاضی عابد، ۲۰۱۶ اسلام آباد، ص ۱۳۱،

۲۔ فہمیدہ ریاض، فیمنزم اور ہم (مضمون) مشمولہ: فیمنزم اور ہم، مرتبہ: فاطمہ حسن، ڈاکٹر، وعدہ کتاب گھر، کراچی، جون ۲۰۰۵ء، ص ۳۲

۳۔ جانثار مومن، تانیثیت: چند بنیادی مباحث (مضمون) مطبوعہ: اردو ریسرچ جنرل، شمارہ: ۸، اپریل۔ اگست ۲۰۱۵ء، نئی دہلی، ص ۵۶

۴۔ Laura Bruneu and Elinor Burkett, Feminism, www.britanica.com, February, 2019, 3:20 PM 19th

۵۔ محمد حسین، تانیثیت: نظریات، مغربی تناظرات (مضمون)، www.urdulink.com، ۱۸ فروری ۲۰۱۹ء، 10:30pm

۶۔ اعجاز الرحمن، تانیثیت اور قرۃ العین حیدر کے نسوانی کردار، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، بار دوم، جولائی ۲۰۱۰ء، ص ۸۔۷

۷۔ الطاف انجم، ڈاکٹر، اردو میں مابعد جدید تنقید، (اطلاقی مثالیں: مسائل ممکنات) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، اشاعت اول، دسمبر ۲۰۱۳ء، ص ۲۹۴

۸۔ اعجاز الرحمن، تانیثیت اور قرۃ العین حیدر کے نسوانی کردار، عرشیہ پبلی کمیشنز، دہلی بار دوم جولائی ۲۰۱۰ء، ص ۱۳

۹۔ On the subjection of women by John Stuart Mill, theguardian.com, 20th February, 2019, 6:40 pm

۱۰۔ اعجاز الرحمن، تانیثیت اور قرۃ العین حیدر کے نسوانی کردار،، ص ۴۸

۱۱۔ عظمیٰ فرمان، تانیثیت: عورت کو عورت سمجھنے کی تحریک، aikrozen.com، ۱۹ فروری ۲۰۱۹ء، 9:20pm

۱۲۔ عقیلہ جاوید، ڈاکٹر، اردو ناول میں تانیثیت، شعبہ اردو بہاالدین ذکریایونیورسٹی ملتان، جولائی ۲۰۰۵ ،ص۵۹

۱۳۔ عتیق اللہ، تانیثیت ایک مطالعہ (مضمون) مشمولہ: اردو ادب اور تانیثیت،، ص ۱۳۳

۱۴۔ سیما صغیر، ڈاکٹر، تانیثیت اور اردو ادب، (روایت، مسائل اور امکانات، براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۱۸ء، ص ۱۷

۱۵۔ فوزیہ رانی، پاکستانی اردو افسانہ نگار خواتین کے افسانوں میں نسوانی کردار،: تحقیقی و تنقیدی جائزہ (۱۹۴۷ء تا ۲۰۰۰ء) پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۱۴ (غیر مطبوعہ)

۱۶۔ محمد الیاس، تاریخ کے مسخرے (افسانہ)، مطبوعہ: سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۹۶، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۲ء، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ص ۷۹

۱۷۔ صوفیہ یوسف، ڈاکٹر، جدید اردو ادب اور نسائی رجحانات، (مضمون) مطبوعہ: معیار، شمارہ: ۵، شعبہ اردو بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، ص ۳۵۳

۱۸۔ انور سن رائے، سرکس کے ایک مسخرے کا اختتام (افسانہ)، مطبوعہ: سہ ماہی: ادبیات، شمارہ ۹۶، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۲ء، ص ۸۴

۱۹۔ ثمینہ اختر، خواتین افسانہ نگاروں کے افسانوں میں نسائی شعور (خصوصی مطالعہ عصمت چغتائی، بانو قدسیہ، خالدہ حسین) تحقیقی مقالہ برائے ایم فل (اردو)، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۱۹۰ (غیر مطبوعہ)

۲۰۔ کرن شفقت، فیصلہ (افسانہ)، مطبوعہ: سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۵، ۲۰۱۵ء، ص ۹۱

۲۱۔ نورین روبی، تانیثیت اور پاکستانی اردو ادب، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اردو)، شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۲۷۴

۲۲۔ خالد فتح محمد، فرار (افسانہ)، مطبوعہ: سہ ماہی ادبیات شمارہ ۱۰۵، ۲۰۱۵ء، اسلام آباد، ص ۹۱

۲۳۔ نورین روبی، تانیثیت اور پاکستانی اردو ادب، ص ۲۸۹

۲۴۔ نورین روبی، تانیثیت اور پاکستانی اردو ادب، ص ۱۷

۲۵۔ کرن شفقت، فیصلہ (افسانہ)، ص ۱۱۶
۲۶۔ نورین روبی، تانیثیت اور پاکستانی اردو ادب، ص ۲۸۸
۲۷۔ فردوس انور قاضی، ڈاکٹر، اردو افسانہ نگاری کے رجحانات، مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۵۸۵
۲۸۔ محمد ظہیر، اشتباہ نظر، مطبوعہ سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۷، ۲۰۱۵ء، ص ۱۲۶
۲۹۔ حنیف باوا، قصہ اس بہری یخ بستہ رات کا (افسانہ)، مطبوعہ، سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۹، ۲۰۱۶ء، ص ۱۰۰
۳۰۔ معظمہ تنویر، قلعہ بند شہزادی (افسانہ) مطبوعہ: سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۹، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۵ء، ص ۱۱۸
۳۱۔ محمد الیاس، قضائے معلق (افسانہ) مطبوعہ سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۱۳، ۲۰۱۷ء، ص ۶۷۔۶۶
۳۲۔ انور سن رائے، سرکس کے ایک مسخرے کا اختتام (افسانہ)، مطبوعہ: سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۹۶، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۲ء، ص ۸۳
۳۳۔ سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر، جدید اردو افسانہ نگاری کے رجحانات، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی ۲۰۱۶ء، ص ۵۵۵
۳۴۔ خالد فتح محمد، دیواروں کے راز (افسانہ)، مطبوعہ: سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۳، ص ۲۰
۳۵۔ فوزیہ رانی، پاکستانی اردو افسانہ نگار خواتین کے افسانوں میں نسوانی کردار، تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص ۱۹۶
۳۶۔ نیلم احمد بشیر، اکیلی (افسانہ)، مطبوعہ: سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۶، ۲۰۱۵ء، ص ۱۰۲
۳۸۔ محمد ظہیر بدر، اشتباہ نظر (افسانہ)، مطبوعہ: سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۷، ۲۰۱۵ء، ص ۱۲۴
۳۹۔ نازیہ یونس، پاکستانی اردو افسانے میں خواتین کے مسائل: تجزیاتی مطالعہ، (آغاز سے ۲۰۱۰ء) تک، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اردو)، شعبہ اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۳۲۔
۴۰۔ فوزیہ رانی، پاکستانی اردو افسانہ نگار خواتین کے افسانوں میں نسوانی کردار، ص ۱۷۳

۴۱۔ محمد الیاس، خاندانی لوگ (افسانہ)، مطبوعہ، سہ ماہی ادبیات، شمارہ۱۰۹، ۲۰۱۶ء، ص۸۹

۴۲۔ نازیہ خلیل عباسی، کسک (افسانہ)، مطبوعہ: سہ ماہی ادبیات، شمارہ۱۰۹، ۲۰۱۶ء، ص۱۶۷

۴۳۔ محولہ بالا، ص۱۳۲

۴۴۔ نورین روبی، تانیثیت اور پاکستانی اردو ادب، ص۲۴۳

۴۵۔ عامر رضا، زحل: مشتری کے اثر میں (افسانہ)، مطبوعہ: سہ ماہی ادبیات، شمارہ۱۱۰، ۲۰۱۶ء، ص۱۸۳

باب پنجم

مجموعی جائزہ، نتائج اور سفارشات

الف۔ مجموعی جائزہ

اردو میں افسانہ ایک اہم صنف ہے۔ ویسے تو یہ بیسویں صدی کی پہلی دہائی کی پیداوار ہے لیکن زمانے کی میزان پر ایک سو سولہ سال کچھ زیادہ وقت محسوس نہیں ہوتا، اس کے باوجود اردو افسانے نے بہت ترقی کی ہے۔ بیشک اردو ادب میں ایسے افسانے لکھے گئے ہیں جن کا تقابل عالمی ادبیات سے کیا جا سکتا ہے۔ پریم چند کا 'کفن'، انتظار حسین کا 'آخری آدمی'، منٹو کا 'نیا قانون' غلام عباس کا 'آنندی'، احمد ندیم قاسمی کا 'سفارش'، اشفاق احمد کا 'گڈریا'، کرشن چند کا 'کچرہ بابا'، راجندر سنگھ بیدی کا 'لاجونتی'، منشایاد کا 'تماشا' اور اسد محمد خان کا 'ترلوچن' ایسے افسانے ہیں جن کو بلاشبہ ادب کا ہر عام قاری بھی جانتا ہے۔ اس طرح اردو افسانے کی خوش قسمتی ہے کہ اس کو ابتداء ہی میں دو اچھے لکھنے والے مل گئے۔ پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم نے اردو افسانے کو مضبوط بنیادوں پر استوار کیا۔

اردو افسانے پر مختلف انداز سے کام کیا گیا۔ مرزا حامد بیگ نے اردو افسانے کی مضبوط تاریخ لکھی تو ڈاکٹر انوار احمد نے اردو افسانے کا جامع تذکرہ تیار کیا۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے بھی اردو افسانے کی روایت پر سیر حاصل بحث کی۔ اردو افسانے کے دیہاتی پس منظر پر ڈاکٹر انور سدید نے کام کیا۔ ڈاکٹر فوزیہ اسلم نے اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات کے حوالے سے کام کیا جبکہ ڈاکٹر شفیق انجم نے اردو افسانے کو بیسویں صدی کی تحریکوں کے ضمن میں دیکھا ہے۔ محققین نے اپنے اپنے انداز سے افسانے کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ افسانے کی فکری جہات پر ہی نہیں بلکہ فنی و اسلوبیائی حوالے سے بھی بحث کی گئی ہے۔

اس مقالے میں معاصر اردو افسانے کو 'ادبیات' کے تناظر میں فکری سطح پر سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ادبیات دراصل موجودہ دور میں اردو کا ایک موقر ادبی جریدہ ہے۔ 'ادبیات' سہ ماہی پرچہ ہے۔ اس میں ملک کے تمام گوشوں سے لکھاری اپنے تحریریں شائع ہونے کے لئے بھیجتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ ایک ملک گیر

سرکاری پرچہ ہے۔ افسانے کے حوالے سے اس میں ایک خاص گوشہ مختص ہے۔ جس میں کثرت سے افسانہ شائع ہوتا ہے۔ ادبیات کا پہلا شمارہ ۱۹۸۷ء میں سامنے آیا۔ تب سے ابھی تک یہ مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ اس طرح یہ ادب کا ایک بے بہا خزینہ اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ زیر نظر تحقیق میں معاصر افسانے کو سمجھنے کے لئے اسی کا انتخاب کیا گیا ہے۔ پھر ۲۰۱۰ء تا حال شائع ہونے والے افسانے کی تین جہات کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ اس میں معاصر افسانے پر نائن الیون کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پھر معاصر افسانے میں عالمگیریت کے اثرات کا تجزیہ کیا اور آخر میں معاصر افسانے میں تانیثیت کے اثرات کو تلاش کیا گیا ہے۔

نائن الیون نے اپنے بعد آنے والے دور کو بہت متاثر کیا۔ ادب چونکہ تنقید حیات ہے اس لئے ادب سب سے زیادہ متاثر ہوا۔ تخلیق کار کا دل و دماغ حساس ہوتا ہے اور وہ عام انسانوں کے مقابلے میں چیزوں کو زیادہ گہرائی سے دیکھتا ہے۔ یہاں پر بھی یہی ہوا کہ مغرب کے ادباء نے اس واقعہ کو پس منظر بنا کر خوب ادب تخلیق کیا۔ بعد میں یہ رجحان اردو میں بھی در آیا۔ اس کی وجوہات پر تفصیل سے گفتگو ہوئی ہے۔ پاکستان اس جنگ کا مرکزی حصہ بن گیا۔ نائن الیون کے بعد جنگ میں کود گیا جس کی وجہ سے اپنے ملک میں دہشت گردی کے واقعات کا ہونا معمول بن گیا۔

امن و امان کی خراب صورتحال کو معاصر افسانے کی روشنی میں دیکھا جا سکتا ہے کہ لوگوں کے اندر پائے جانے والے خوف اور بے چینی کو بھی طشت از بام کیا ہے افسانہ نگاروں نے ہمیں دکھایا ہے کہ کس طرح عبادت گاہیں بھی تخریب کاروں کے ناپاک ارادوں سے محفوظ نہیں۔ مساجد جو خدا کا گھر اور امن کا گہوارہ تھا وہاں پر بھی تخریب کار کوئی نہ کوئی ناپاک حرکت کر دیتے ہیں جس سے انسانی جانوں کا ضیاع ہوتا ہے۔ کسی جگہ جب کوئی دھماکہ ہوتا ہے تو اس کے بعد کے رد عمل کی عکاسی بھی مختلف افسانہ نگاروں نے اپنے اپنے انداز سے کی ہے۔ بم دھماکوں کی ناگوار تصویریں ہمیں سب افسانوں میں بکھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ انسانی خون جس نا قدری کا شکار ہے اس کی عکاسی کئی افسانوں میں نظر آتی ہے۔

تخریب کاروں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا ان کے دل میں ہمدردی نام کا جذبہ ختم ہوا ہوتا ہے، ان کو پرواہ نہیں ہوتی کہ کس کی گود اجڑ رہی ہے، کون یتیم ہو رہا ہے، کون بیوہ ہو رہی ہے اور کسی خاندان کا چراغ بجھانے پر اس خاندان پر کیا گزارے گی۔ اس قابل رحم صورت حال کو بھی تخلیق کاروں نے اپنے افسانوں

میں پرویا ہے۔

امن و امان کی خراب صورتحال کے پیش نظر معاصر انسان زیادہ ہجوم والی جگہوں پر جانے سے کتراتا ہے۔ دراصل مشاہدے میں آیا ہے کہ تخریب کاروں کی نظر ایسی جگہوں پر ہوتی ہے جہاں زیادہ سے زیادہ انسان اکٹھے ہوں۔ رش سے معاصر افراد امن و امان کی خراب صورتحال کی وجہ سے گھبراتا ہے۔ اس سلسلے میں افسانہ نگاروں نے ایسے ایسے سوالات اٹھائے ہیں جو ہمیں گہری فکر میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

پھر تخریب کار چنے ہوئے لوگوں پر بھی حملے کرتے ہیں۔ ان کی نظر اعلیٰ شخصیات پر بھی ہوتی ہے جہاں وہ لوگوں کو نشانہ بناتے ہیں۔ زیادہ تر دیکھنے میں آیا ہے کہ بڑے بڑے سیاستدان، علماء، فنکار اور صحافی ان کے نشانے پر ہوتے ہیں۔ تخریب کاروں کی اس روش کو بھی ادباء نے محسوس کرتے ہوئے اپنے افسانوں میں بیان کیا ہے۔ کراچی شہر جو پاکستان کا اولین دارالخلافہ بھی تھا اور سب سے بڑا شہر بھی ہے۔ وہاں پر امن کی خراب صورتحال بہت تشویشناک ہے۔ اب کراچی کے شب و روز بدل چکے ہیں۔ اس کا احساس بھی افسانہ نگار کو ہے۔

امن و امان کی خراب صورتحال کے بعد افراد میں جنم لینے والی بے چینی اور پیدا ہونے والے خوف کو بھی معاصر افسانہ نگار نے آشکار کیا ہے۔ اب انسان گھر سے باہر نکلے تو گھر والے اس کی سلامتی کی دعا کرتے ہیں۔ واپس آنے تک بے چین رہتے ہیں۔ ایسی ہی کیفیت کا بیان بھی ہم نے افسانوں میں دیکھا ہے۔

امریکہ نے افغانستان پر چڑھائی کی۔ وہاں پر اسلحے کا بے دریغ استعمال کر کے طالبان کے بہانے عام انسانوں کا بھی قتل عام کیا۔ پھر اسی نائن الیون کے رد عمل کے طور پر پاکستان کو بھی اس جنگ میں گھسیٹا گیا۔ پھر یہاں پر جو ہوا ہم سب نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس صورت حال کا عکس بھی آج کے افسانے میں جھلکتا ہے۔

معاصر افسانے میں مغربی ممالک کے عزائم کی عکاسی بھی کی ہے۔ مشرقی پر لگائی جانے والی طرح طرح کی پابندیاں، دہشت گردی کو مسلمانوں سے منسوب کرنے کی سازش اور مسلمانوں پر زندگی آئے روز تنگ کرنے کی کاوشوں کو بھی طشت از بام کیا ہے۔ دراصل امریکہ نے روس کو شکست دینے کے لئے دہشت گرد خود تیار کئے بعد میں ان کو ختم کرنے کے درپے ہو گیا۔ اب مسلمان، مسلمان کیخلاف لڑ رہا ہے، یہ لڑانا بھی

دراصل یہودی سازش ہے۔ اس صورت حال کو معاصر افسانہ نگار نے شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے۔

عالمگیریت کے معاصر افسانے پر اثرات کا تجزیاتی مطالعہ زیر نظر تحقیق کا حصہ ہے۔ عالمگیریت سے مراد دنیا کا کو ایک دوسرے سے رابطہ تیز ہو گیا ہے۔ لوگ ایک دوسرے سے رابطہ آسانی سے کر سکتے ہیں۔ سفر کی سہولتیں بہت تیز ہو چکی ہیں۔ انسان ابھی ادھر ہے تو کچھ لمحے بعد دنیا کے کسی دوسرے خطے میں ہو گا۔ اب دنیا کے ایک کونے میں بیٹھ کر دوسرے کونے میں بات کر سکتا ہے۔ وہاں پر رابطہ کر سکتا ہے۔ ویڈیو کال نے اس سلسلے میں اور بھی آسانیاں پیدا کر دی ہیں۔ اب حقیقت میں دنیا ایک 'عالمی گاؤں' کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ جس میں رابطہ سہل اور تیز تر ہو گیا۔ اب شہر بھی پھیلتے جا رہے ہیں، گاؤں ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ اب پرانی تہذیب کا نوحہ ہی نظر آتا ہے۔ ساتھ عالمگیر تہذیب نے گاؤں کی تہذیب و ثقافت پر بھی اثر ڈالا ہے۔ عالمگیریت کے درپردہ دراصل امریکیت اور صیہونیت کو فروغ دینے کی جو کوشش نظر آتی ہے اس کے اثرات واضح طور پر موجود ہیں۔ ہماری خوبصورت اقدار کو بھی گرہن لگتا جا رہا ہے۔ اب مشرق کی خوبصورت اقدار ختم ہو رہی ہیں ان کی جگہ جدید تہذیب کی جدید اقدار نے لے لی ہے۔ ہمارے معاشرے میں یہ سب عناصر نظر آتے ہیں جب تہذیبی سطح پر عالمی منظر نامہ اتنی تیزی سے بدل رہا ہو تو ژرف نگاہی رکھنے والا تخلیق کار کیسے خاموش رہ سکتا ہے۔ اس لئے عالمگیریت کے واضح اثرات معاصر افسانے پر نظر آتے ہیں۔

معاصر افسانے میں اب ہماری پرانی تہذیب کا نوحہ ہی بیان کیا جاتا ہے۔ سادگی نام کی خوبصورت قدر جو ہماری مشرقی تہذیب کے ماتھے کا جھومر تھی اب بدل چکی ہے۔ اب اس کی جگہ بناوٹ اور غیر فطری انداز نے لے لی ہے۔

لوگوں کے رہن سہن میں بھی بڑی حد تک تبدیلی آئی ہے۔ گھروں کے نقشے بدل چکے ہیں۔ جتنا خرچہ گھر پر ہوتا ہے اس سے دوگنا خرچہ باتھ رومز پر کیا جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں پرانے زمانے کا انسان جس طرح زندگی گزارتا تھا۔

دوسری طرف جدید ٹیکنالوجی نے انسانی زندگی کو جہاں بہت سی سہولیات پہنچائی ہیں وہاں پر دوسری طرف ان کے منفی اثرات بھی مرتب ہوئے ہیں۔ بیماریوں کے جس قدر علاج دریافت اور ان کی تشخیص کے لئے جدید مشینری تیار کی گئی لیکن دوسری طرف بیماریوں کی کثرت میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ افسانہ نگاروں نے

اس کربناک صورت کو اپنے افسانوں میں بیان کیا ہے۔

کتاب کلچر کو بھی جدید ٹیکنالوجی متاثر کیا ہے۔ اب زیادہ مطالعہ لیپ ٹاپ، موبائل اور ٹیپ پر کیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے کتاب سے محبت کرنے والے کڑھتے ہیں۔ اب تو وہ کتاب کی قدر ہی ختم ہو گئی۔ جدید تہذیب نے گاؤں کے کلچر کو بہت متاثر کیا ہے۔ اب جدید مشینری اور ٹیکنالوجی گاؤں اور دیہات میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ گاؤں اور شہروں کے درمیان فرق برائے نام ہی رہ گیا ہے بلکہ شہری تہذیب گاؤں کی تہذیب پر غالب آتی جارہی ہے۔ گاؤں کے بدلتے ہوئے کلچر کو معاصر افسانے میں دیکھ سکتے ہیں۔

افسانہ نگاروں نے دکھایا ہے کہ کس طرح جدید مواصلات کے ذرائع نے زندگی کو پوری طرح بدل کر رکھ دیا ہے۔ معاصر افسانے کے مطالعے سے ہم نے دیکھا کہ ہر آنے والا دن قصہ ایک دن کے بعد قصہ پارینہ بنتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ برق رفتار ترقی نے انسان کی زندگی کو خطرے میں بھی ڈال دیا ہے۔ اب انسان نے دوسرے سیاروں کا بھی رخ کیا ہے۔ ہے کہ دوسرے سیارے بھی انسانی قدموں کے نیچے آچکے ہیں۔ اب بجلی شہروں میں ہی نہیں بلکہ دیہاتوں میں بھی پہنچ چکی ہے، جس کی وجہ سے دیہات میں جدید ٹیکنالوجی کا استعمال عوام ہوتا جارہا ہے۔ اس بدلتی دنیا کو ہم معاصر افسانے میں دیکھ جاسکتا ہے۔

عالمگیریت کے اغیار کی تہذیب ہم پر غالب آتی جارہی ہے۔ اب ماڈرن کے نام پر ہر کوئی جو کر رہا ہے وہ کسی طور پر بھی ہمارے ہاں موجود نہ تھا اور نہ ہی وہ ہمارے لئے موزوں ہے۔ ہم مغرب کے اس قدر دلدادہ ہو گئے ہیں کہ وہاں پر تعلیم حاصل کرنے جاتے ہیں پھر وہاں ہی پر شادی اور گھر بنالیتے ہیں۔ بہت سے واقعات میں ایسا سننے میں آیا ہے کہ لوگ مغرب میں جاکر وہاں ہی کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔

مغرب میں ہی ناجائز رشتے بنانے کا رجحان ہے۔ ان کی دیکھا دیکھی یہ رجحان ہمارے اندر بھی سرایت کر چکا ہے۔ مغرب کی یہ روایات کیسے ہمارے اندر سرایت کر رہی ہیں اس کی عکاسی معاصر افسانے میں موجود ہے۔ فلموں نے بھی ہماری تہذیب پر اثر ڈالا ہے۔ فلموں کی پیروی میں ہم بھی وہی انداز اختیار کر لیتے ہیں۔ بعض دفعہ ہم اس راستے پر چل نکلتے ہیں، جس کا کوئی اختتام نہیں ہوتا۔

اب عورتوں اور مردوں کا اختلاط بڑھتا جارہا ہے۔ جامعات میں آئے روز دیکھا جاتا ہے کہ یہ فرق ختم ہوتا جارہا ہے۔ ہماری تہذیبی روایات مرد اور عورت کو کھلم کھلا اس بات کی اجازت نہیں ایک دوسرے سے

ملیں لیکن اب اس سے بڑھ کر بہت کچھ ہو رہا ہے۔ کم ہوتے ہوئے ان فاصلوں کو ہم تخلیق کاروں کے ہاں محسوس کر سکتے ہیں۔

عالمگیریت کی اس نفسا نفسی نے لالچ، جھوٹ اور مادیت پرستی کو ہوا دی ہے۔ اب دوسرے کا حق مارنا ہم جائز سمجھتے ہیں۔ نوکریوں کے معاملے میں بیوروکریسی جس طرح اپنا اقرباء میں نوکریاں تقسیم کرتی ہے یا اعلیٰ ٹھیکے بھی رشوت پر دیئے جاتے ہیں اور پھر ان میں کروڑوں کے گھپلے کیے جاتے ہیں۔

جدید تہذیب نے معاصر انسان کے لئے بہت سے جنسی اور نفسیاتی مسائل بھی پیدا کئے ہیں۔ ٹیکنالوجی کی برق رفتار ترقی نے جہاں آسانیاں پیدا کی ہیں وہاں پر بہت سی غیر اخلاقی بیماریوں کو بھی تقویت بخشی ہے۔

افسانہ نگاروں نے دکھایا ہے کہ کس طرح بچے دن بھر موبائل، لیپ ٹاپ اور ٹیبلٹ میں گھسے رہتے ہیں۔ انہیں صرف یہ چیزیں عزیز ہیں باقی کوئی رشتہ ان کے لیے معانی نہیں رکھتا۔ بعض جگہوں پر افسانہ نگاروں نے ہمارے معاشرے کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا ہے۔ آج کے دور میں رشتے بہت تیزی سے بنتے ہیں پھر ان رشتوں میں قربتیں بڑھتی ہیں اور آخر کو یہ جنسی تعلق بن جاتا ہے۔ افسانہ نگاروں نے دکھایا ہے کہ عملی طور پر قریب آنے سے قبل ہی جوڑا موبائل پر سب کچھ کر چکا ہوتا ہے ان کے لیے کوئی بات نئی بات نہیں ہوتی۔

مقالہ ہذا میں معاصر افسانے کو تانیثیت کے حوالے سے سمجھنے کی سعی کی۔ تانیثیت دراصل ایک ایسی تحریک ہے جس کا مقصد عورتوں کے لیے مردوں کے مساویانہ حقوق کے لیے جدوجہد کرنا، عورتوں کے پیش آنے والے مسائل، ان کے ساتھ روا رکھے جانے والے معاندانہ سلوک کی مذمت کرنا اور عورتوں کو یہ ثابت کرنے کے مواقع دینا کہ وہ کسی بھی لحاظ سے مردوں سے کم نہیں ہیں۔

اس سب کے باوجود بھی مشاہدے میں آیا ہے کہ عورتوں کے ساتھ صنفی امتیاز برتا جاتا ہے۔ عورت کے مقابلے میں مرد کو بہتر سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً بیٹے کی پیدائش پر گھی کے چراغ جلائے جاتے ہیں جبکہ بیٹی کی پیدائش کو اچھا نہیں سمجھا جاتا یہی صنفی امتیاز ہے۔

معاصر افسانہ نگار نے ہمیں ہمارے معاشرے کی تلخ تصویریں دکھائی ہیں۔ عورت اور مرد اگر دونوں

ایک گناہ میں شریک ہیں تو عورت کو زیادہ گناہ گار ٹھہرایا جاتا ہے اگر کوئی عورت کسی مرد کی مرضی سے اس کے ساتھ شادی کر کے اپنا گھر بار اور والدین کو تج کر دے اس کے باوجود اس کو طعنے دیے جاتے ہیں۔ اس صنفی امتیاز کو افسانہ نگار نے ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔

صنفی امتیاز کی ناگوار صورتیں ہمیں معاصر افسانے میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ افسانوں کے مطالعہ سے ہم نے دیکھا کہ کسی طرح بیوی کو ایک خاوند صنفی امتیاز روا رکھا جاتا ہے۔ افسانوں کے مطالعے سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ بعض اوقات خواتین کے ساتھ غیر انسانی رویہ دیکھنے کو بھی ملتا ہے۔

بیٹی اور بیٹے کے لیے الگ الگ معیارات کا وجود بھی ہمارے معاشرے کا حصہ ہے۔ بیٹی کے پیدائش کو نیک شگون نہیں خیال کیا جاتا جب کہ بیٹے کی پیدائش پر گھی کے چراغ جلائے جاتے ہیں۔ پھر بیٹے کے مقابلے میں کس طرح بیٹی کی زندگی کی قربانی دی جاتی ہے ایسی ہی فرسودہ روایات کی بھنیٹ چڑھتی ہوئی عورت کی تصویر افسانوں میں نظر آتی ہے۔

پھر اگر عورت ان پڑھ ہے تو اس کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ خاوند بھی اپنے آپ کو اس کے مقابلے میں بڑا خیال کرتا ہے۔ اس حالت کو بھی افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔

ہمارے معاشرے میں شادی سے قبل بیٹی اور بہن کی مرضی کم ہی پوچھی جاتی ہے۔ اس کی پسند کے متعلق نہیں پوچھا جاتا ہے۔ اس کیفیت کا بھی ہمارے عہد کے افسانہ نگار نے محسوس کیا ہے۔

صنفی استحصال کی ناگوار صورتوں کی عکاسی بھی معاصر افسانے میں موجود ہے۔ بعض افسانوں میں دیکھا گیا ہے کہ کس طرح ایک خاوند اپنی بیوی کو آمدن کا ذریعہ بناتا ہے۔ مرد اس کو استعمال کر کر جب خوب دولت سمیٹ لیتا ہے تو اس کو گھر سے نکادیتا ہے۔ ایسے غیر انسانی اور غیر اخلاقی رویے کو افسانوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔

بعض صورتوں میں یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ مرد جسمانی طور پر اپنے مضبوط ہونے کا فائدہ اٹھا کر عورت پر ظلم کرتا ہے۔ اس کو مارنا، پیٹنا بلکہ تیزاب تک پھینکا جاتا ہے۔ اس ظلم اور زیادتی کی عکاسی بھی بعض افسانوں میں موجود ہے۔ گھر میں موجود مرد ہونے کے باوجود عورت کو مزدوری پر لگا دینا اور خود آرام کرنا یہ کوئی انصاف نہیں ہے۔

اس طرح معاصر اردو افسانے میں یہ اہم فکری رجحانات تھے جن پر مقالہ ہذا میں بحث کی گئی ہے۔

ب۔ نتائج

ا۔ 'ادبیات' کے تناظر میں معاصر اردو افسانے کے مطالعے کے دوران ہم پر کئی در وا ہوئے۔ 'ادبیات' ایک موقر ادبی جریدہ ہے جس میں افسانہ تسلسل اور باقاعدگی کے ساتھ چھپتا ہے۔ یہ افسانے مقدار اور معیار دونوں کے لحاظ سے تسلی بخش ہیں ان کے فکری مطالعے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ آج کا اردو افسانہ نگار حالات پر گہری نظر رکھتا ہے۔ عالمی منظر نامے پر بھی اس کی نگاہ تیز بخوبی مرکوز ہے۔ جیسا کہ نائن الیون کے بعد کی صورتحال کو افسانہ نگاروں نے موضوع بحث بنایا ہے۔

۲۔ امن وامان کی خراب صورتحال کی عکاسی بھی معاصر افسانے میں نظر آتی ہے جہاں کسی کی جان ومال محفوظ نہیں ہے۔ تخریب کاروں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا ان کے پیش نظر صرف کشت وخون ہوتا ہے۔ اس ناگفتہ بہ حالت کو ہم نے معاصر افسانے میں واضح طور پر دیکھا ہے۔

۳۔ امن وامان کی خراب صورتحال کے نتیجے میں رونما ہونے والی بے چینی کو بھی افسانہ نگاروں نے طشت از بام کیا ہے۔ جب انسان کی جان اور مال محفوظ نہ ہوں تو ظاہر ہے وہ بے چین ہو گا، خوف کا شکار ہو گا۔ اس لیے افسانہ نگار نے اس خوف کو احسن انداز سے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔

۴۔ مغربی ممالک اور امریکہ نے جس انداز سے دہشت گردی کو صرف مسلمانوں کے ساتھ مخصوص کر دیا ہے۔ مغربی ممالک نے مسلمان ممالک پر طرح طرح کی پابندیاں بھی لگا دی ہیں۔ مغربی ممالک کی ان سازشوں کو بھی جدید افسانہ نگاروں نے طشت از بام کیا ہے۔

۵۔ اب اس کی وجہ سے معمولات زندگی میں بھی تبدیلی آئی ہے۔ رہن سہن، نشست وبرخاست اور محافل کے رنگ میں واضح تبدیلی آچکی ہے اور آج کے افسانہ نگار نے حالات زندگی میں اس تبدیلی کو محسوس کرتے ہوئے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔

۶۔ ٹیکنالوجی کی برق رفتار ترقی نے بھی ہماری زندگی کو مکمل طور پر بدل کر رکھ دیا ہے۔ اب دنیا ایک عالمی گاؤں کی شکل اختیار کر چکی ہے، فاصلے مٹ چکے ہیں۔ مواصلات اور ذرائع نقل وحمل کی ترقی سے دنیا کو عالمی

گاؤں بننے میں اور بھی تقویت ملی ہے۔ اس کا احساس افسانہ نگار کو واضح طور پر ہے۔ معاصر افسانے کے مطالعے سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اب ہماری خوبصورت اقدار ختم ہو رہی ہیں۔ اخلاقی اقدار جو ہماری تہذیب کے ماتھے کا جھومر ہوتی تھی اب وہ برائے نام اور ماضی کا نشان کے طور پر باقی ہیں۔ معاصر افسانے کے مطالعے کے دوران دیکھا کہ گاؤں کی زندگی بھی بدل چکی ہے۔ اب وہاں بھی سادگی اور فطری حسن کی بجائے بناوٹ اور تصنع نے زور پکڑا ہے۔ بے چارگی کی فضاء کو بھی دھچکا لگا ہے۔ افسانہ نگار نے دیہات میں ہونے والی تبدیلیوں کو محسوس کیا ہے۔

۷۔ عالمگیریت کے نام پر مغرب کی اقدار کو فروغ دینے کے جال پھینکے جا رہے ہیں۔ ہمارے اندر کی مغرب پرستی کو بھی افسانہ نگار نے محسوس کیا اور اسے تخلیقی حسن سے آمیز کر کے پیش کیا ہے۔ معاصر افسانے کے مطالعے کے نتیجے میں ہم نے دیکھا کہ تانیثی افکار افسانے میں پوری طرح رچے سے ہوتے ہیں۔

۸۔ صنفی امتیاز کی وجہ سے عورت کے ساتھ روا رکھے جانے والا سلوک پھر عورت کے مقابلے میں مرد کو ترجیح دینا اور معاشرتی رسم و رواج کی بھینٹ چڑھتی ہوئی عورت کو بھی معاصر افسانے میں دیکھا جا سکتا ہے۔

۹۔ صنفی امتیاز کے ساتھ ساتھ صنفی استحصال کی صورتیں بھی آج کے افسانے میں موجود ہیں۔ عورت کے ساتھ ظلم کرنا، اس کے جذبات مجروح کرنا اور اس کی حقی تلفی کرنا صنفی استحصال کی صورتیں افسانوں میں دکھائی دیتی ہیں۔

ج۔ سفارشات

۱۔ زیر نظر تحقیق میں اردو افسانے کو ۲۰۱۰ تا حال فکری لحاظ سے دیکھا گیا۔ ادبیات کے اجرا سے ۲۰۱۰ تک کے افسانے کو بھی موضوع تحقیقی بنایا جا سکتا ہے۔

۲۔ ادبیات نے عالمی ادب کے حوالے سے بھی کافی مقدار میں ادب چھاپا ہے۔ عالمی ادب کے نمبرز پر بھی کام کی گنجائش موجود ہے۔

۳۔ ادبیات میں شاعری کی ایک بڑی مقدار شائع ہوتی ہے اس کو موضوع تحقیق بنایا جا سکتا ہے۔

۴۔ ادبیات میں مقامی زبانوں کے ادب کے تراجم بھی شائع ہوتے رہے ہیں اس پر بھی کام کیا جا سکتا ہے۔

کتابیات

الف۔ بنیادی ماخذ

سہ ماہی ادبیات، شمارہ:۱، سن ۱۹۸۷ء

سہ ماہی ادبیات، شمارہ:۸۶۔۸۵، سن ۲۰۱۰

سہ ماہی ادبیات، شمارہ:۹۶، سن ۲۰۱۱ء

سہ ماہی ادبیات، شمارہ:۹۸، سن ۲۰۱۱ء

سہ ماہی ادبیات، شمارہ:۱۰۰، سن ۲۰۱۲ء

سہ ماہی ادبیات، شمارہ:۱۰۳، سن ۲۰۱۴ء

سہ ماہی ادبیات، شمارہ:۱۰۵، سن ۲۰۱۵ء

سہ ماہی ادبیات، شمارہ:۱۰۶، سن ۲۰۱۵ء

سہ ماہی ادبیات، شمارہ:۱۰۷، سن ۲۰۱۵ء

سہ ماہی ادبیات، شمارہ:۱۰۹، سن ۲۰۱۶ء

سہ ماہی ادبیات، شمارہ:۱۱۰، سن ۲۰۱۶ء

سہ ماہی ادبیات، شمارہ:۱۱۲۔۱۱۱، سن ۲۰۱۷ء

سہ ماہی ادبیات، شمارہ:۱۱۳، سن ۲۰۱۷ء

سہ ماہی ادبیات، شمارہ۱۱۷۔۱۱۶، سن ۲۰۱۸ء

سہ ماہی ادبیات، شمارہ:۱۱۸، سن ۲۰۱۸

ب۔ ثانوی ماخذ

i۔ کتب

آصف فرخی، ڈاکٹر، انتظار حسین: شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد ۲۰۰۶ء

انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختص تاریخ، عزیز بک ڈپو، لاہور، بار پنجم، ۲۰۰۶ء

انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ، ایک صدی کا قصہ، مثال پبلشرز فیصل آباد، نقش ثانی ۲۰۱۰ء

اسلم سراج، محمد منشاء یاد، شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء

اعجاز الرحمن، تانیثیت اور قرۃ العین حیدر کے نسوانی کردار، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، بار دوم، جولائی ۲۰۱۰ء

الطاف یوسفزئی، ڈاکٹر فہمیدہ گل درانی (مرتبین) اردو نظم اور ۱۱/۹، شعبہ اردو، ہزارہ یونیورسٹی، مانسہرہ، ۱۱ ستمبر ۲۰۱۲ء

الطاف انجم، ڈاکٹر، اردو میں مابعد جدید تنقید، (اطلاقی مثالیں: مسائل ممکنات) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، اشاعت اول، دسمبر ۲۰۱۳ء

بشری رحمن، چپ، آہو الیہ بک ڈپو، نئی دہلی، ۲۰۰۶ء

بی بی آمنہ، خالدہ حسین، شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء

پاکستانی زبان و ادب پر ۱۱/۹ کے اثرات، مرتبہ: ادارہ ادبیات اردو، جامعہ پشاور و ہائر ایجوکیشن کمیشن پشاور، ۲۰۱۰ء

حمیرا اشفاق، جدید اردو فکشن، عصری تقاضے اور بدلتے رجحانات، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰

خاور نقوی، پوٹھوہار میں اردو افسانہ نگاری، (تحقیقی و تنقیدی جائزہ)، کاشف بک ڈپو، اسلام آباد، ۱۹۹۷ء

رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی ادب اور رجحانات، پورب اکادمی اسلام آباد، طبع اول، ۲۰۱۰ء

رشید امجد، ڈاکٹر، جدید ادبی تناظر، الفتح پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۳ء

سلیم اختر، ڈاکٹر، افسانہ اور افسانہ نگار: تنقیدی مطالعہ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۳ء

سلیم اختر، ڈاکٹر، مجموعہ ڈاکٹر سلیم اختر (مقالات)، سنگ میل پبلیکیشنز، ۲۰۰۶ء

سلیم اختر، افسانہ حقیقت سے علامت تک، مکتبہ عالیہ، لاہور، اکتوبر ۲۰۰۶
سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر، جدید اردو افسانے کے رجحانات، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۱۶ء
شفیق انجم، ڈاکٹر، اردو افسانہ (بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں) پورب اکادمی، اسلام آباد، فروری ۲۰۰۸ء
شفیق انجم، ڈاکٹر، رشید امجد، شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد ۲۰۱۰ء،
سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر، جدید اردو افسانے کے رجحانات، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۱۶ء
سیما صغیر، ڈاکٹر، تانیثیت اور اردو ادب، (روایت، مسائل اور امکانات، براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۱۸ء
صبا اکرام، جدید افسانہ، چند صورتیں، زین پبلی کمیشنز، کراچی، بار اول، دسمبر ۲۰۰۱ء
صاحب علی، ڈاکٹر، اردو فکشن کا مطالعہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی، اکتوبر ۲۰۰۶ء
صفیہ عباد، رشید امجد کے افسانوں کا فنی و فکری مطالعہ، پورب اکادمی، اسلام آباد ۲۰۰۷ء
طاہر اقبال، گنجی بار، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء
طاہرہ اقبال، پاکستانی اردو افسانہ، سیاسی و تاریخی تناظر میں، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۵ء
عقیلہ جاوید، ڈاکٹر، اردو ناول میں تانیثیت، شعبہ اردو بہاالدین ذکریا یونیورسٹی ملتان، جولائی ۲۰۰۵ء
عشرت رحمانی، چند ہم عصر افسانہ نگار (تجزیاتی جائزے)، جاودان پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۰۶ء
فاطمہ حسن (مرتبہ)، فیمنزم اور ہم، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۲۰۰۵ء
قاضی عابد، ڈاکٹر، (مرتبہ)، اردو ادب اور تانیثیت، بار اول، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء
فردوس انور قاضی، اردو ادب کے مختلف زاویے، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء
مقصودہ حسین، ڈاکٹر، مسعود مفتی، شخصیت و فن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء
مرزا حامد بیگ، اردو افسانے کی روایت، (۱۹۰۳ء۔۲۰۰۹ء)، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء
مرزا حامد بیگ، جانکی بائی کی عرضی، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۱ء
مرزا حامد بیگ، افسانے کا منظر نامہ، مکتبہ عالیہ، لاہور، بار اول، س ن
محمد حمید شاہد، اردو افسانہ 'صورت دھنی' سٹی پک پوائنٹ، کراچی، ۲۰۱۸ء

نجیبہ عارف، ڈاکٹر، رفتہ و آئندہ: اردو ادب کا منظر نامہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء
نجیبہ عارف (مرتبہ)، 9/11 اور پاکستانی اردو افسانہ، پورپ اکادمی، اسلام آباد، بار اول، مئی ۲۰۱۱ء
یوسف مثالی (مرتبہ)، کلیاتِ اقبال مع فرہنگ عبد اللہ اکیڈمی لاہور، ۲۰۰۹ء

ii۔ مقالہ جات

ثمینہ اختر، خواتین افسانہ نگاروں کے افسانوں میں نسائی شعور (خصوصی مطالعہ عصمت چغتائی، بانو قدسیہ، خالدہ حسین) تحقیقی مقالہ برائے ایم فل (اردو)، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء
تیمور اختر، ادبیات کے شخصیات نمبرز کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، مقالہ برائے ایم فل اردو، وفاقی اردو یونیورسٹی، اسلام آباد، اگست ۲۰۱۷ء
سعدیہ افتخار، اکادمی ادبیات پاکستان کی خدمات: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ (اردو زبان و ادب کے حوالے سے)، مقالہ برائے ایم فل (اردو) نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد
فوزیہ رانی، پاکستانی اردو افسانہ نگار خواتین کے افسانوں میں نسوانی کردار: تحقیقی و تنقیدی جائزہ (۱۹۴۷ء تا ۲۰۰۰ء) پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۱۱ء
نازیہ ملک، پاکستانی اردو افسانے میں عصری آگاہی، تجزیاتی مطالعہ، آغاز تا ۲۰۱۰ء، مقالہ برائے پی ایچ ڈی، (اردو) نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، جنوری ۲۰۱۴ء

iii۔ رسائل و جرائد:

اردو ریسرچ جنرل، شمارہ پانچ، نئی دہلی اپریل ۲۰۱۵ء
خیابان (ششماہی)، جامعہ پشاور، شعبہ اردو پشاور، خزاں ۲۰۰۶ء
معیار، شمارہ ۹:ء، شعبہ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۱۳ء
اکادمی ادبیات پاکستان، (تعارف نامہ)

iv۔ ویب گاہیں (انٹرنیٹ ذرائع)

aikrozen.com

www.bbc.com

www.britanica.com

express.pk

www.intechoen.com

www.nlpd.gov.pk

www.pal.gov.pk

, www.piic.com

www.theguardian.com

www.urdulink.com